Regd. L. No.7243

Phone 880800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

نومبر 1984

اس پرچہ میں

اُمت آج جس خلاف ایک نیا فتنہ

فنڈا مینٹل ازم

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ-لاہور

قیمت فی پرچہ 4 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

بدل اشتراک سالانہ پاکستان ۴۸/- روپے غیر ممالک ۹۸/- روپے	ٹیلیفون :- ۸۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور	قیمت فی پرچہ ۴ چار روپے
جلد ۳۷	نومبر ۱۹۸۴ء	شمارہ ۱۱

فہرست

۱۔ لمعات : بتقریب یوم پیدائش علامہ اقبالؒ ——— ۲

۲۔ فنڈامینٹلزم۔ امت کی تباہی کی انتہائی خطرناک سکیم ——— ۱۰

۳۔ تحریکِ پاکستان اور مولانا حسین احمد مدنیؒ ——— ۵۳

(از سید نور محمد قادری)

۴۔ نقد و نظر ——— ۶۰

ایڈیٹر: محمد خلیل، ناشر شیخ عبدالمجید، مقام اشاعت، ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور، مطبوعہ اشرف پرنٹنگ پریس ۹، ایبک روڈ لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

بتقریب یومِ پیدائش علامہ اقبالؒ

لمعات

(حسین یادوں کے اُجلے چراغ)

اس سے پہلے ملک میں علامہ اقبالؒ کے یومِ وفات (۲۱۔ اپریل) کی تقریب منائی جاتی تھی اب کچھ عرصہ سے اسے (نامعلوم کن وجوہات کی بناء پر) ان کے یومِ پیدائش (۹۔ نومبر) سے تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی چنداں اہمیت نہیں کہ وہ تقریب ان کے یومِ پیدائش کی نسبت سے منائی جاتی ہے یا یومِ وفات کی نسبت سے۔ ان تقاریب سے مقصد متعلقہ شخصیت کے ان احسانات کی یاد تازہ کرانا ہوتا ہے جن کے زیرِ بار اس کی قوم ہوتی ہے، اور ہر قوم کیطرف سے اظہارِ تشکر جسے اس کی بارگاہ میں خراجِ تحسین پیش کرنے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جہاں تک علامہ اقبالؒ کے، امتِ مسلمہ پر بالعموم، اور ملتِ پاکستانیہ پر بالخصوص احسانات کا تعلق ہے، وہ اس قدر کثیر، دقیع اور گراں بہا ہیں کہ ان کی سپاس گذاری سے کما حقہ، عہدہ برا ہونا مشکل ہے۔ ایک مفکر کے پیغام کی عظمت اور اس کی خدمات کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے قوم کے قلب و نگاہ میں کس قسم کا، اور کسقدر انقلاب پیدا کیا۔ اس پیمانے سے ماپئے تو، دور دور تک نگاہ دوڑانے سے بھی اقبالؒ کا ہمسر نہیں ملتا۔ مذہبی نقطہ نگاہ سے مصلحین (ریفارمرز) اور بھی کئی نظر آئیں گے لیکن ان کی نگاہ یا دسترس شجرِ اسلام کی شاخ تراشی تک محدود رہی۔ یہ اقبالؒ تھا جس کی دوررس اور ژرف بین نگاہ اُس کی اصل و بنیاد تک پہنچی اس نے کہا کہ سوال اس خرابی یا اس خرابی کا نہیں۔ ہمارا مروجہ اسلام، سرے سے حقیقی اسلام ہے ہی نہیں۔ یہ وہ سکہ ہے جو ہمارے دورِ ملوکیت کے ٹکسالوں میں ڈھلا اور ہماری مذہبی پیشوائیت کے ضرار میں جس کا چلن ہے۔ جب تک اس اسلام کو حقیقی اسلام سے بدلا نہیں جائے گا، شجرِ ملت کی کوئی شاخ نہ سرسبز و شاداب ہوگی نہ بار آور۔ یہ اسلام، قرآنِ مجید کے دفتینِ قرآن میں محفوظ (اور اب ملفوف) ہے۔ بنابریں اُس نے ملتِ اسلامیہ سے کہا کہ ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بقراں زیستن

اگر تو مسلمان کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو اس کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ تو قرآن کے مطابق معاشرہ قائم کرے۔

اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی واضح کر دیا کہ یہ آسان کام نہیں۔ اسلام کو مذہبی پیشوائیت

کے جنگل سے چھڑانے کا فریضہ وہی شخص سرانجام دے سکے گا جو جرأت و بسالتِ فاروقیؓ کے ساتھ اس انقلاب آفرین نعرہ کو لے کر اٹھے کہ — حسبنا کتاب اللہ۔ ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔

پھر اقبالؒ ان مفکرین میں سے نہیں تھا جن کا نام محض نظریات بہم پہنچانا ہوتا ہے۔ انہوں نے یہ انقلاب آفرین نظریہ پیش کیا اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ اسے عملاً متشکل کرنے کی کیا صورت ہوگی۔ اس نے (۱۹۳۰ء کے خطبۂ صدارت میں) کہا کہ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ ایک ایسا خطۂ زمین حاصل کیا جائے جس میں مروجہ اسلام مملکتی حیثیت سے پہلے سے رائج نہ ہو۔ وہاں صدرِ اول کے سے قرآنی اسلام کو عملاً نافذ کیا جا سکے گا۔

لیکن اقبالؒ با ایں ہمہ بالغ نظری، اپنے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں تھا۔ وہ اپنی حدود استطاعت سے بخوبی واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے جس قسم کی قائدانہ سیاسی اور تنظیمی صلاحیتوں اور خصوصیتوں کی ضرورت ہے یا تو وہ ان کا حامل نہیں اور یا اس کی گرتی ہوئی صحت اور مضمحل توانائی اس کشمکش کی حریف نہیں ہو سکتی جو اس کے لئے ناگزیر تھی۔ اس کی نگہِ بصیرت ایک ایسی شخصیت کی تلاش میں نکلی جو اس فریضہ سے عہدہ برآ ہونے کی سکت رکھتا ہو۔

اس مقام پر پہنچ کر انسان ورطۂ حیرت میں گم ہو کر رہ جاتا ہے کہ اس کی نگہِ تجسس جا کر ٹکی تو کس شخصیت پر ٹکی! اس شخصیت پر جس کی ساری زندگی اقبالؒ کے نظریات اور تصورات کے یکسر خلاف تھی۔ یہ شخصیت تھی مسٹر محمد علی جناحؒ کی جس کا نظریہ نیشنلزم، عقیدہ نیشنلزم اور عمل نیشنلزم تھا۔ وہ (ہندوؤں۔ مسلمانوں پر مشتمل) متحدہ قومیت کا علمبردار، اور وطنی جمہوریت کا داعی تھا۔ جس کی ساری زندگی انہی وادیوں کی دشت پیمائیوں اور صحرا نوردیوں میں گذری تھی اور جب وہ اپنی تگ و تاز میں ناکام رہ گیا، تو بجائے اس کے کہ اپنے نظریات میں تبدیلی کر لے، وہ دل برداشتہ ہو کر وطن سے دور، انگلستان جا بیٹھا اور مستقل طور پر وہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ اقبالؒ کی نگہ دور رس نے اس مقصد کے حصول کے لئے جو جناح کے مسلک کے یکسر خلاف تھا، جناح کا انتخاب کیا اور انتخاب کیا تو اس حتم و یقین کے ساتھ کہ انہیں لکھا کہ،

> میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف ہیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ میرا آپ کو بار بار لکھنا گراں نہیں گذرتا ہوگا۔ (میرے اس تکرار اور اصرار کی وجہ یہ ہے کہ) میری نگاہوں میں اس وقت ہندوستان بھر میں آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں جس کے ساتھ ملت کو اپنی یہ امیدیں وابستہ کرنے کا حق ہے کہ آپ اس طوفان میں جو یہاں آنے والا ہے، اس کشتی کو صحیح و سالم، بہ امن و عافیت، ساحلِ مراد تک لے جائیں گے۔ (اقبالؒ کے خطوط جناحؒ کے نام)

ہندو پاک کی تاریخ کا یہ سب سے اہم سوال ہے کہ جناحؒ کو انگلستان سے کون واپس لے کر آیا، اور واپس بھی اس انداز سے کہ اس نے اپنی ساری سابقہ زندگی کی متاع کو رود بارِ انگلستان

میں ڈبو دیا اور ایک نیا سفینۂ حیات لے کر واپس آیا۔ اگر سوال صرف "روٹھے ہوئے جناحؒ" کو منا کر لانے کا ہوتا تو اس کے لئے کوئی کانگریسی لیڈر یا ان کا وفد جاتا۔ لیکن وہ لوگ جناحؒ کے مزاج سے واقف تھے اور اُس سے درحقیقت مایوس ہو چکے تھے، اس لئے انہوں نے اس سعی لاحاصل کی جرأت نہیں کی۔ جناحؒ جس طرح اپنے تمام سابقہ نظریات پر خطِ تنسیخ کھینچ کر اور ان سے یکسر متضاد تصورات لے کر لوٹا تھا۔ اس سے واضح ہے کہ یہ کارنامہ بہرحال کسی عظیم مسلمان شخصیت ہی کا ہو سکتا تھا۔ چونکہ ہمارے ہاں ابھی تک نہ تو تحریکِ پاکستان کی کوئی مستند تاریخ مرتب ہوئی ہے اور نہ ہی اقبالؒ اور جناحؒ کے قابلِ اعتماد سوانح حیات مدوّن ہوئے ہیں اس لئے اس کا کریڈٹ مختلف لیڈروں کو دیا جاتا ہے۔ لیکن ایک بنیادی نقطہ بالکل واضح ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ مسٹر جناحؒ نے جو (نیشنلسٹ) نظریات اختیار کئے تھے اور جن کے مطابق اپنی زندگی بسر کی تھی انہوں نے انہیں کسی کانگریسی لیڈر کی اندھی تقلید کی بنا پر اختیار نہیں کیا تھا۔ وہ ان کی عمر بھر کی سوچ بچار کا نتیجہ تھے۔ وہ ان کے حق میں جو دلائل دیتے تھے ان کی اس زمانے کی تقاریر اور بیانات ان سے لبریز ہیں۔ ان نظریات کو ترک کر کے ان کی جگہ ان نظریات کو اختیار کرنا جن کے مطابق انہوں نے تحریکِ پاکستان کی لڑائی لڑی (مذہب کی زبان میں یوں سمجھئے گویا) کفر چھوڑ کر اسلام لانے" کے مرادف تھا۔ ہم پھر کہیں گے کہ جو لوگ جناحؒ کے مزاج سے واقف اور ان کی سیرت سے آشنا ہیں وہ جانتے ہیں کہ جناح کو ایسی بنیادی تبدیلی کے لئے سوچنے پر آمادہ کرنا ہی نہیں بلکہ ان میں ایسی تبدیلی پیدا کر دینا کسی عام شخصیت کا کام نہیں ہو سکتا تھا۔ ایسا انقلاب کوئی ایسی شخصیت ہی پیدا کر سکتی تھی جو علمی اور فکری سطح پر بھی جناحؒ سے زیادہ قدآور ہوتی اور جس کے خلوص اور دیانت پر جناحؒ کو کامل اعتماد بھی ہوتا۔ آپ اس دور کی فضا پر گہری نگاہ ڈالئے۔ اقبالؒ کے سوا کوئی شخصیت اس معیار پر پوری نہیں اترتی۔ یہ اقبالؒ ہی تھا جو جناحؒ کے قلب و نگاہ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکا۔ حسنِ اتفاق سے اس کی تائید میں ہمیں ایک شہادت بھی ملتی ہے، اور وہ بھی کسی مسلم لیگی یا پاکستانی کی نہیں) بلکہ ایک غیر مسلم انگریز کی۔ مسٹر ہیکٹر بولیتھو (HECTOR BOLITHO) نے قائداعظمؒ کی سوانح عمری لکھی ہے جس کا نام ہی (JINNAH) ہے وہ اس میں لکھتا ہے:۔

> مسٹر جناحؒ نے لندن میں، سر محمد اقبالؒ سے بہت سی ملاقاتیں کیں، وہ بڑے اچھے دوست تھے۔ مسٹر جناحؒ اگرچہ (اپنے سابقہ سیاسی مسلک کے متعلق) اب کسی غلط فہمی میں نہیں تھے، بایں ہمہ وہ اقبالؒ کے دلائل سے (اتنی جلدی) متفق نہیں ہوئے۔ اس میں قریب اسّل[1] سال کا عرصہ لگ گیا کہ مسٹر جناحؒ نے اس کا اعتراف کیا کہ ہندوستان کی سیاست کے گہرے مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ اقبالؒ کا نقطۂ نظر صحیح ہے۔ (ص۹۰)

---

[1] ہم سمجھتے ہیں کہ اتنا زیادہ عرصہ نہیں لگا تھا۔

اس تبدیلیٔ فکر و نظر کے بعد جب مسٹر جناحؒ واپس وطن آئے تو بیکتھر بولیتھو نے ان کی اس وقت کی کیفیت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے :-

مسٹر جناحؒ اپنے بمبئی کے مکان میں بالکل تنہا تھے۔ ان کے پاس کوئی ذاتی سٹاف نہیں تھا۔ حتیٰ کہ کوئی سیکرٹری بھی نہیں جو ان کے خطوط کی نقلیں رکھ سکتا اور ان کے کاغذات کو باقاعدہ فائل کئے جاتا۔ اس بے قاعدگی کے باوجود، ان کے دراز میں خطوط کا ایک ایسا بنڈل تھا جن سے وہ تسکینِ خاطر حاصل کیا کرتے تھے۔ یہ وہ خطوط تھے جو علامہ اقبالؒ نے انہیں، انگلستان میں ۱۹۳۲ء میں کی گئی ملاقات کے بعد لکھے تھے۔ اقبالؒ نے ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کے ایک خط میں لکھا تھا کہ "ہندی مسلمانوں کے مسائل کا واحد حل یہی ہے کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، انہیں باقی ماندہ ملک سے الگ کر کے، ان میں آزاد مملکت یا مملکتیں قائم کر دی جائیں۔ کیا آپ کا خیال نہیں کہ اس کے لئے مناسب وقت آ پہنچا ہے؟ (ص ۱۱۱)

آپ سوچئے کہ علامہ اقبالؒ کے خطوط کا وہ بنڈل جس کی طرف بولیتھو نے اشارہ کیا ہے، ملت کے لئے کس قدر متاعِ گراں بہا تھا۔ لیکن وائے بر حالِ ما کہ ان خطوط کا کوئی پتہ نشان نہیں ملتا۔ نہ ہی ان خطوط کا جو قائداعظمؒ نے جواب میں لکھے تھے۔ "اقبالؒ کے خطوط جناحؒ کے نام" کا مجموعہ شائع ہوا ہے اس میں مئی ۱۹۳۶ء تا نومبر ۱۹۳۷ء کے چند خطوط ہیں۔ مسٹر بولیتھو جن خطوط کا ذکر کرتا ہے وہ ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۶ء کے درمیانی عرصہ کے معلوم ہوتے ہیں۔

مسٹر بولیتھو نے جو کچھ لکھا ہے قرائن اس کی تائید کرتے ہیں۔ یہ اقبالؒ کی جناحؒ کے ساتھ ملاقاتوں اور اگم گشتہ خط و کتابت کا نتیجہ تھا جو جناحؒ کے نظریات میں ایسی انقلابی تبدیلی کا موجب بنے۔

ہم نے شروع میں لکھا ہے کہ علامہ اقبالؒ کے ملّتِ پاکستانیہ پر بہت سے احسانات ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان میں یہ احسان بھی کچھ کم گرانقدر نہیں کہ وہ مسٹر جناحؒ کے نظریات میں اس قدر محیر العقول تبدیلی پیدا کرنے اور انہیں مراجعت فرمائے وطن ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ سوچئے کہ اگر مسٹر جناحؒ میں یہ تبدیلی نہ آتی اور وہ ان تبدیل شدہ نظریات کے ساتھ واپس نہ لوٹتے تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا؟ اس صورت میں نہ پاکستان وجود میں آتا، نہ ہم آزادی کا خواب تک بھی دیکھ سکتے۔

کیا اقبالؒ کا یہ احسان کچھ کم گراں بہا ہے؟ کیا اس کے لئے ان سے ایسا کہنے میں کچھ بھی مبالغہ ہو گا کہ ؎

زندگی آپ کی نوازش ہے　　ورنہ ہم کب کے مر گئے ہوتے!

ہم جانیں یا نہ جانیں! اقبالؒ کے اس احسان کو جناحؒ خوب جانتا تھا، اور جناحؒ کے مقام کو اقبالؒ خوب پہچانتا۔ اور اس حقیقت کے شاہد تحریکِ تحسین کے وہ تحائف ہیں جو انہوں نے ایک دوسرے کی خدمت میں پیش کئے تھے۔ علامہ اقبالؒ کی وفات کی خبر سن کر قائداعظمؒ نے جو تعزیتی بیان دیا تھا وہ غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ انہوں نے کہا تھا :-

مجھے سر محمد اقبالؒ کی وفات کی خبر سن کر سخت رنج ہوا۔ وہ عالمی شہرت کے ایک نہایت

ممتاز شاعر تھے اور ان کی شہرت اور ان کے کام ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ملک اور مسلمانوں کی انہوں نے اتنی بہت سی خدمات انجام دی ہیں کہ ان کے ریکارڈ کا مقابلہ عظیم ترین ہندوستانی کے ریکارڈ سے کیا جا سکتا ہے جو کبھی پیدا ہوا ہو، حال تک وہ پنجاب کی صوبہ وار مسلم لیگ کے صدر تھے جب کہ ایک غیر متوقع علالت نے انہیں استعفیٰ پر مجبور کر دیا۔ وہ کل ہند مسلم لیگ کی پالیسی اور پروگرام کے حامی تھے۔ میرے لئے وہ ایک رہنما تھے۔ دوست اور فلسفی اور تاریک ترین لمحوں میں جن میں سے مسلم لیگ کو گزرنا پڑا۔ وہ چٹان کی طرح قائم رہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی کبھی متزلزل نہیں ہوئے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ صرف تین دن قبل انہوں نے اس کامل اتحاد کا ذکر پڑھا یا سنا ہوگا جو کلکتہ میں پنجاب کے مسلم قائدین کے مابین ہو گیا اور آج میں فخر و مباہات کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانانِ پنجاب پورے طور پر اب لیگ کے ساتھ اور مسلم لیگ کے علم تلے آ چکے ہیں جو یقیناً سر اقبالؒ کے لئے عظیم ترین اطمینان کا واقعہ تھا۔ اس مفارقت میں میری نہایت مخلصانہ اور عمیق ترین ہمدردیاں ان کے خاندان کے ساتھ ہیں۔ اس نازک وقت میں ہندوستان کو اور خصوصاً مسلمانوں کو ایک مہیب نقصان پہنچا ہے۔" [1]

اس میں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قائداعظمؒ نے علامہ اقبالؒ کو "اپنا راہنما" کہا ہے۔ اس ایک لفظ سے یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ مسٹر جناحؒ میں اُس انقلابی تبدیلی کے پیدا کرنے کا ذمہ دار کون تھا جس کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے۔

یہ کچھ تو قائداعظمؒ نے علامہ اقبالؒ کے متعلق کہا۔ حضرت علامہ کے دل میں قائداعظمؒ کا کسقدر احترام تھا۔ اس کا اندازہ دو ایک واقعات سے لگائیے۔

مارچ ۱۹۴۰ء میں بزمِ اقبالؒ کے سالانہ اجلاس میں، سر عبدالقادر (مرحوم) نے علامہ اقبالؒ کے ایک خط کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے جو انہوں نے ایک دوست کے خط کے جواب میں بسترِ علالت سے ۱۹۳۵ء میں لکھا تھا۔ اس دوست نے علامہؒ کی صحت کی دعا کی تھی۔ علامہؒ نے لکھا تھا:

میرا وقت پورا ہو چکا ہے اور میرا پیغام ملت تک مکمل صورت میں پہنچ چکا ہے۔ میرے لئے صحت کی دعا مانگنے کی بجائے آپ قائداعظم محمد علی جناح اور کمال اتاترک کے لئے درازیٔ عمر کی دعا کیجئے کہ انہیں ابھی اپنا مشن پورا کرنا ہے۔

(نوائے وقت مورخہ ۹ مارچ ۱۹۷۷ء)

۱۹۳۵ء میں پنڈت جواہر لعل نہرو، علامہ اقبالؒ سے ملنے کے لئے آئے تو میاں افتخار الدین مرحوم نے

---

[1] سب رس (اقبال نمبر) جون ۱۹۳۸ء، جلد نمبر ۶ صفحہ نمبر ۶۷۔ بحوالہ کتاب "علامہ اقبال اور قائداعظمؒ کے سیاسی نظریات" از محمد حنیف شاہد ص ۲۹۷

حضرت علامہؒ سے کہا کہ لیگ کی قیادت آپ خود اپنے ہاتھ میں کیوں نہیں لیتے؟ اس پر انہوں نے ایک ثانیہ کے توقف کے بغیر فرمایا، "میں تو مسٹر جناحؒ کا ایک معمولی سپاہی ہوں"۔[1] یعنی قائداعظمؒ علامہ اقبالؒ کو اپنا راہنما قرار دیتے ہیں اور علامہ اقبالؒ اپنے آپ کو قائداعظمؒ کا معمولی سپاہی ہونے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

قائداعظمؒ نے مختلف تقاریب پر علامہ اقبالؒ کی خدمات کو کن زریں الفاظ میں سراہا تھا، ان کے متعلق طلوعِ اسلام میں وقتاً فوقتاً لکھا جاتا رہا ہے۔ لیکن چونکہ موجودہ (۹ نومبر) کی تقریب کا تقاضا ہے کہ ان کی یاد تازہ کی جائے اس لئے ہم ان کے اعادہ میں کوئی بات نہیں سمجھتے۔ عقیدت اور خلوص کے پھول کبھی مرجھایا نہیں کرتے۔ قائداعظمؒ نے دسمبر ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ (پٹنہ) کے اجلاس میں فرمایا۔

> علامہ اقبالؒ کی وفات مسلمانانِ ہند کے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ مسلم لیگ ان کی وفات پر پہلے ہی اظہارِ تعزیت کر چکی ہے۔ وہ میرے ذاتی دوست تھے اور ان کا شمار دنیا کے عظیم شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک اسلام زندہ رہے گا۔ ان کی بلند پایہ شاعری، مسلمانانِ ہند کی تمناؤں اور آرزوؤں کی ترجمان ہے۔ وہ ہمارے اور ہماری آنے والی نسلوں کے دلوں میں تازہ روح پھونکتی رہے گی۔
>
> (تقاریر محمد علی جناحؒ ص ۴۲)

انہوں نے ۱۹۴۰ء میں یومِ اقبالؒ کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے، علامہ اقبالؒ کو ان الفاظ میں یاد فرمایا:

> اقبالؒ میرا پرانا دوست تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ آل انڈیا مسلم لیگ ابتداء میں ایک علمی سی جماعت تھی۔ ۱۹۳۶ء میں ہم میں سے بعض نے خیال کیا کہ اس جماعت کو صحیح پارلیمانی جماعت میں بدل دیا جائے۔ جب میں اپریل ۱۹۳۶ء میں پنجاب آیا تو پہلا شخص جسے میں ملا وہ اقبالؒ تھا۔ میں نے اپنے خیالات ان کے سامنے پیش کئے۔ انہوں نے فوراً لبیک کہا اور اسی وقت سے تا دمِ مرگ وہ میرے ساتھ مضبوط چٹان کی طرح کھڑے رہے۔ علامہ اقبالؒ عظیم انسان اور بلاشبہ بہت بڑے فلاسفر تھے۔ جب تک مشرقی زبانیں موجود رہیں گی، اقبالؒ کا کلام زندہ رہے گا۔ وہ خود ہندوستانی تھے لیکن دنیا میں شاعرِ اعظمؒ کی حیثیت سے متعارف تھے۔ انہوں نے مسلم سیاسی شعور پیدا کرنے میں گراں بہا خدمات سرانجام دیں۔ میں اس کی ایک مثال بیان کرتا ہوں۔ ایک مرتبہ میں علی گڑھ میں ریل کا سفر کر رہا تھا۔ راستہ میں ایک چھوٹے سے سٹیشن پر گاڑی ٹھہری تو سینکڑوں کی تعداد میں دیہاتی جمع ہو گئے۔ میں حیران تھا کہ ان کے اجتماع کا مقصد کیا ہے کہ دفعتہً ان سب نے اقبالؒ کا یہ ترانہ پڑھنا

---

[1] اقبالؒ کے آخری دو سال (عاشق حسین بٹالوی) [illegible]۔

شروع کر دیا۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا

شعراء اقوام میں زندگی پیدا کرتے ہیں۔ ملٹن، شیکسپیئر، بائرن وغیرہ نے قوم کی بے بہا خدمت کی ہے۔ لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے۔ اقبالؒ نے سب سے زیادہ خدمت کی ہے۔ کارلائل نے شیکسپیئر کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے ایک انگریز کا ذکر کیا ہے کہ اسے جب شیکسپیئر اور دولتِ برطانیہ میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا تو اس نے کہا کہ میں شیکسپیئر کو کسی قیمت پر نہ دوں گا۔ گو میرے پاس سلطنت نہیں لیکن اگر سلطنت مل جائے اور اقبالؒ اور سلطنت میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کی نوبت آئے تو میں اقبالؒ کو منتخب کروں گا۔" [1]

قائدِ اعظمؒ نے ۱۹۴۱ء کے یومِ اقبالؒ کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

اگر میں اس تقریب (یومِ اقبالؒ) میں شامل نہ ہوتا تو اپنی ذات کے ساتھ بڑی ناانصافی کرتا۔ میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ مجھے اس جلسہ میں شریک ہو کر اقبالؒ کو عقیدت کے پھول پیش کرنے کا موقع ملا ہے۔ اقبالؒ کی ادبی شہرت عالمگیر ہے کہ وہ مشرق کے بہت بڑے بلند پایہ شاعر اور مفکرِ اعظم تھے۔ مرحوم دورِ حاضر میں اسلام کی تاریخ تھے۔ اس زمانہ میں اقبالؒ سے بہتر اسلام کسی اور شخص نے نہیں سمجھا۔ مجھے اس کا فخر ہے کہ میں نے ان کی قیادت میں بحیثیت ایک سپاہی کے کام کیا ہے۔ میں نے ان سے زیادہ وفادار اور اسلام کا شیدائی نہیں دیکھا۔ جس بات کو وہ صحیح خیال کرتے یقیناً وہ صحیح ہوتی تھی اور وہ اس بات پر مضبوط چٹان کی طرح قائم رہتے تھے۔ [2]

اللہ اکبر! علامہ اقبالؒ اپنے آپ کو قائدِ اعظمؒ کا سپاہی قرار دیتے ہیں اور قائدِ اعظمؒ فرماتے ہیں کہ مجھے اس کا فخر ہے کہ میں نے علامہ اقبالؒ کی قیادت میں بحیثیت ایک سپاہی کے کام کیا ہے"۔ سچ ہے

محبت چوں تمام افتد رقابت از میاں خیزد　　بطوفِ شعلہ پروانہ با پروانہ می رقصد

قائدِ اعظمؒ نے ۱۹۴۲ء میں یومِ اقبالؒ کی تقریب پر علامہ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا:۔

میں اس دن جب کہ ہمارے عظیم ملّی شاعر اور مفکر اقبالؒ کا یوم منایا جا رہا ہے، خلوصِ قلب سے انہیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ان کی روح کو بے پایاں رحمت سے ابدی سکون عطا فرمائے۔

(بحوالہ کتاب: قائدِ اعظمؒ - ص ۵۴)

---

[1] "انقلاب" ۲۹ مارچ ۱۹۴۰ء

[2] ہفتہ وار حمایتِ اسلام ۱۳ مارچ ۱۹۴۱ء

انہوں نے یومِ اقبالؒ کی تقریب (منعقدہ لاہور، دسمبر ۱۹۴۴ء) پر حسبِ ذیل پیغام ارزانی فرمایا:۔

اس تقریبِ سعید کے موقعہ پر، جو ہمارے عظیم ملی، مردِ درویش، حکیم (الامت) اور مفکر کی حسین یاد منانے کے لئے منعقد کی جا رہی ہے، میں مرحوم کی بارگاہ میں قلبی خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں۔

وہ اگرچہ آج ہم میں زندہ موجود نہیں لیکن ان کی شاعری، جو یقیناً لافانی ہے، ہماری راہنمائی اور روح پروری کے لئے ہر وقت ہمارے پاس ہے۔ ان کی شاعری، جس کا انداز نہایت حسین اور زبان نہایت شیریں ہے، اس عظیم شاعر کے قلب و دماغ کی صحیح تصویر ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ اس سے ہمیں نظر آتا ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات سے کس قدر سرشار اور اس کے کس حد تک وفاشعار تھے۔ وہ حضورؐ نبی اکرم کے ایک سچے اور پرخلوص متبع تھے ———

وہ اوّل بھی مسلمان تھے اور آخر بھی مسلمان۔ وہ ترجمان الاسلام، بلکہ صوت الاسلام تھے۔

علامہ اقبالؒ ایک نظری مبلغ اور مفکر ہی نہیں تھے۔ وہ جرأت اور عمل، استقامت اور خود اعتمادی کی محکم چٹان تھے۔ اور ان سے بھی بلند، خدا پر غیر متزلزل یقین اور اسلام کے ساتھ بلے پناہ عقیدت کے پیکر۔ ان کی ذات میں ایک شاعر کے تخیلات اور ایک ایسے انسان کی حقیقت پسندی کے خواص مجتمع تھے جو حالات کا عملی نقطۂ نگاہ سے جائزہ لیتا ہے۔ عملِ پیہم اور (خدا پر) یقینِ محکم، یہ ہے ان کے پیغام کا خلاصہ۔ اور اس سے وہ ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے دنیا کے سامنے (نمودار ہوتے ہیں۔ اسلامی اصولوں (کی حکمیت) پر انہیں غیر متزلزل یقین تھا۔ کامیابی سے ان کی مراد، تعمیرِ خودی تھی۔ اور ان مقاصد کے حصول کا ذریعہ، اسلامی تعلیمات کا اتباع ——— تعمیرِ خودی اور عملِ پیہم، نوعِ انسان کے نام ان کا پیغام تھا۔

وہ اگرچہ ایک عظیم شاعر تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ایک عملی سیاستدان بھی تھے۔ وہ اسلامی اصولوں پر ایمانِ کامل اور یقینِ محکم کی بناء پر ان چند افراد میں سے تھے جنہوں نے سب سے پہلے یہ خیال پیش کیا کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں کو الگ کر کے ایک اسلامی مملکت متشکل کی جا سکتی ہے۔ یہ علاقے مسلمانوں کے تاریخی اماکن بھی ہیں۔

میں اقبالؒ ڈے کی اس تقریب میں عمق قلب سے شریک ہوں۔ اور دعا کرتا ہوں کہ ہم اپنے اس ملی شاعر کے پیش کردہ نظریات پر عمل پیرا ہوں تاکہ جب مملکتِ پاکستان متشکل ہو تو ہم ان نظریات کو عملی قالب میں ڈھال سکیں۔

خریدار صاحبان متوجہ ہوں

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سُلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

فنڈامینٹل ازم

(امت کی تباہی کی انتہائی خطرناک سکیم)

علامہ اقبالؒ نے کہا ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے "تا امروز" چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

سوال یہ ہے کہ چراغِ مصطفویؐ کیا ہے جس کے ساتھ، ازل سے "تا امروز"، شرارِ بولہبی ستیزہ کار چلا آرہا ہے۔ یہ کون سی کشمکش ہے جس کا سلسلہ دراز، نوعِ انسان کی پوری تاریخ کو محیط ہے۔ اس تماشہ گاہ میں ہزاروں قومیں آئیں اور چلی گئیں۔ سینکڑوں نظام ابھرے اور بیٹھ گئے۔ متعدد تہذیبوں کے چراغ جلے اور بجھ گئے۔ لیکن وہ کون سے ایسے حریفانِ ازلی ہیں جن کی باہمی آویزش پر ان تمام تغیرات کا کوئی اثر نہ ہوا، اور ان کی ستیزہ کاری کا سلسلہ، ہر دور اور ہر مقام میں بدستور جاری رہا اور اب تک جاری ہے۔ آپ انسانی تاریخ پر جس قدر بھی غور کریں گے ایک ہی نتیجہ پر پہنچیں گے، کہ وہ کشمکش پیہم۔ وہ ستیزِ مسلسل۔ وہ آویزشِ متواتر

دین اور مذہب کی جنگ

ہے۔ جس دن سے شعورِ انسانی نے آنکھ کھولی، اس جنگ کا سلسلہ شروع ہوا اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ملوکیت۔ سرمایہ پرستی وغیرہ بھی انسانیت کے کم دشمن نہیں، لیکن اگر آپ ذرا بہ نظرِ تعمق دیکھیں گے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ یہ، اور اسی قسم کے دیگر مستبدانہ تصوّرات اور نظام، مذہب ہی کے سہارے قائم رہے ہیں اور جب دین نے مذہب کو مٹایا تو پھر اس کے ساتھ یہ خود بخود مٹ گئے اس لئے اصل کشمکش دین اور مذہب ہی کی ہے۔

مذہب کی دسیسہ کاریاں

مذہب کا تصور، مفاد پرست انسانوں کے ذہن کا تراشیدہ ہے جن کا مقصد یہ تھا کہ وہ دوسرے انسانوں کی کمائی پر عیش کی زندگی بسر کریں اور یہ کچھ اس انداز سے کریں کہ یہ انہیں لوٹیں اور وہ انہیں

دعائیں دیں۔ یہ انہیں دھتکاریں اور وہ ان کے پاؤں پڑیں۔ یہ انہیں بلا جرم و قصور گالیاں دیں اور وہ گڑگڑا کر معافیاں مانگیں۔ یہ بھری محفل میں انہیں بے عزت کریں لیکن وہ اپنے کمرے کی تنہائیوں میں، اپنے دل کے اندر بھی ان کی شان میں گستاخی کا خیال تک نہ لاسکیں۔ یہ ان سے ہر قسم کی خدمت اور بیگار لینا اپنا حق سمجھیں اور وہ ان کے ہر حکم کی تعمیل، اپنی زندگی کا مقدس ترین فریضہ قرار دیں۔ ان کے ادنیٰ سے اشارے پہ اپنے سینے میں خنجر گھونپ لیں، اپنے بچوں کے گلے پہ چھری پھیر دیں۔ آگ میں کود پڑیں۔ پہاڑ کی چوٹی سے سر کے بل نیچے آگریں۔ تختہ دار پہ ہنسی خوشی چڑھ جائیں۔ ان کی بھتوں کے آہنی پہیوں کے نیچے آکر کچلے جائیں۔ یہ اپنے جس حریف کے خلاف چاہیں، انہیں کھڑا کر دیں، اور وہ۔ اتنا جانے اور پوچھے بغیر کہ ہمیں ان کے خلاف کیوں لڑایا جارہا ہے، ان کی جانیں لینے اور اپنی جانیں دینے جائیں۔ وہ خود بھوکے رہیں اور ان کے خادموں کو لقمے کھلائیں۔ اپنے بچوں کو فاقے سے رکھیں اور ان کے کتوں کو دودھ پلائیں۔ خود ننگے رہیں اور ان کے پتھروں کو حریر و اطلس کے لبادے پہنائیں۔ آپ خس و خاشاک کی جھونپڑیوں میں زندگی کے دن کاٹیں اور ان کی ہڈیوں کی راکھ پر سنگِ مرمر کی فلک بوس عمارات استوار کریں۔ زندگی میں تو ایک طرف، ان کی موت کے بعد بھی ان کے دل پہ ان کا خوف اس طرح طاری رہے کہ وہ ان کے تصور سے ڈرتے، کانپتے، لرزتے، سہمے رہیں۔ غرضیکہ یہ ہر وقت ان بے چاروں کے اعصاب پہ چھلاوے کی طرح سوار اور ان کے ذہن پہ بھوت بن کر چھائے رہیں اور وہ ان کے پنجہ کی آہنی گرفت سے کبھی نکلنے نہ پائیں۔

یہ ہیں اس مذہب کے چند گوشے جسے مفاد پرست انسانوں کی عقلِ فریب کار نے تراشا اور جسے کمزور اور ناتوانوں کا خون چوسنے کے لئے ایک مؤثر ترین حربہ کے طور پہ استعمال کیا گیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ملوکیت اور سرمایہ داری کا استبداد بھی کچھ کم استخوان شکن اور خون آشام واقع نہیں ہوا۔ لیکن انہیں اپنے غلبہ و تسلط کی زنجیریں مستحکم رکھنے کے لئے سینکڑوں قسم کی قوتیں فراہم اور ہزار قسم کے حربے استعمال کرنے پڑتے ہیں اور پھر بھی انہیں ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کب شکار ان کے جال سے نکل جائے۔ لیکن مذہبی دسیسہ کاریوں کا تو یہ عالم ہے کہ اس میں صید خود صیاد را گوید بگیر۔ اس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی ان کی غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کرے تو یہ غلام آگے بڑھ کر اس کا گلا گھونٹ دیں۔ اور اگر کسی وقت کوئی زنجیر اتفاقاً ٹوٹ جائے تو یہ اس کے ٹوٹے ہوئے حلقوں کو اپنی مشرکانہ ارادت سے اٹھا کر چومیں اور بصد عقیدت اپنے گلے میں ڈال لیں۔

مذہب نے اپنی تمام مہرہ بازیوں اور سحر انگیزیوں کے لئے صرف ایک بنیادی حربہ استعمال کیا اور وہ یہ کہ اس نے جو کچھ کرنا چاہا اسے "خدا" کی طرف منسوب کر دیا۔ اس کی ساری گرفت کا راز اسی میں ہے۔ اس کے لئے، اس نے پیش بندی یہ کی کہ لوگوں کو سوچنے سمجھنے سے دور رکھا جائے اور

لوگوں کو جاہل رکھا جائے

عقل و فکر کے قریب نہ آنے دیا جائے۔ کوئی جتنی زیادہ جہالت آمیز باتیں کرے اسے اتنا ہی زیادہ خدا کا مقرب سمجھا جائے۔ جو جس قدر زیادہ بعید از علم و عقل امور پر یقین ظاہر کرے، اسے اتنا ہی زیادہ پختہ ایمان والا قرار دیا جائے۔

ارباب مذہب کی ٹیکنیک ہی یہ ہوتی ہے کہ اپنے معتقدین کو جہالت کے گڑھے سے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ توہم پرستیوں پر ایمان کا مدار، اور عجوبہ پسندیوں کو صداقت کا شعار قرار دیا جائے۔ ان کی طرف سے پیش کردہ عقائد پر ایمان لایا جائے تو بلا علم و دلیل، اور ان کے احکام کی تعمیل کی جائے تو یہ پوچھے بغیر کہ اس سے بالآخر مقصد کیا ہے؟ مذہب کی طرف سے جو کچھ پیش کیا جاتا ہے اس کے حق میں اس کے پاس ایک ہی دلیل اور ایک ہی سند ہوتی ہے۔ اور وہ یہ کہ ایسا کچھ پیچھے سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ ہمارے اسلاف کا یہی مسلک تھا۔ اگر کوئی شخص مذہب کے پیش کردہ کسی عقیدے یا مسلک پر اعتراض کرے تو عوام کو یہ کہہ کر بھڑکا دیا جائے کہ یہ شخص تمہارے اسلاف کی توہین کرتا ہے۔ عوام کے جذبات کو بھڑکا کر جس قدر فتنہ و فساد برپا کیا جا سکتا ہے، مذہب کی تاریخ خونچکاں کا ایک ایک ورق اس پر شاہد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں جس قدر خوں ریزیاں اور فساد انگیزیاں مذہب کے مقدس نام پر ہوئی ہیں، ہلاکو اور چنگیز کے حصہ میں ان کا عشر عشیر بھی نہیں آیا ہوگا۔ یہی وہ حربہ ہے جس سے ارباب مذہب اپنے مخالفین کو اس طرح ڈرا دھمکا کر رکھتے ہیں کہ وہ ان کے خلاف ایک لفظ تک کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ مذہب کا سارا مدار عوام کے جذبات پر ہے۔ اس کے لئے وہ اس قسم کے مواقع پیدا، اور ایسی تقریبات وضع کرتے رہتے ہیں جن سے عوام کے جذبات میں شدت آتی رہے، اور ان کی یہ آگ بجھنے نہ پائے۔

یہ ہے اس مذہب کا اجمالی سا تعارف، جو پہلے دن سے آج تک انسانیت کی گردن میں پھانسی کا پھندا بن کر پڑا ہے۔ اور جس نے نوع انسان کی نس نس کو اس طرح اپنی گرفت میں لے رکھا ہے کہ وہ اس کی مرضی کے خلاف، ذرا سی حرکت بھی نہیں کر سکتی۔

خدا کا دین

اور یہی ہے آکٹوپس کی وہ آہنی گرفت جس سے نوع انسان کو چھڑانے کے لئے، خدا کی طرف سے دین آتا رہا۔ اس دین خداوندی کے پیامبر، حضرات انبیاء کرام

تھے جو مذہب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں کو آزادی کی دعوت دیتے تھے۔ وہ انسانوں کو اس چنگل سے آزاد ہونے کی دعوت دیتے تھے اور ارباب مذہب اپنی پوری قوتوں کو مجتمع کر کے، ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اس محاذ میں ارباب اقتدار، ان کے پشت پناہ اور سرمایہ دار طبقہ ان کا حامی ہوتا تھا۔ اس لئے کہ خدا کا دین، ان کے حق میں بھی تو موت کا پیغام تھا۔ وہ دین کو مغلوب اور مذہب کو غالب رکھنے کی انتہائی کوشش کرتے تھے، کیونکہ مذہب کے غلبہ میں خود انکی ہستی کا راز مضمر تھا۔ دین اور مذہب کی یہی وہ کش مکش ہے جو پہلے دن سے آج تک دنیا کے ہر ملک، ہر قوم اور ہر زمانے میں مسلسل اور پیہم چلی آ رہی ہے، اور اسی کو علامہ اقبالؒ، چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی کی ستیزہ کاری سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اسے انسانیت کے لئے بدترین لعنت اور خدا کا عذاب قرار دیتے ہیں۔ وہ جاوید نامہ میں لکھتے ہیں:

چار مرگ اندر پئے ایں دیر پیر سود خوار و والی و ملا و پیر

یعنی مذہب کا شجرۃ الزقوم اور اس کی پروردہ شاخیں۔ ملوکیت اور سرمایہ داری

ہمارے زمانے میں سرمایہ داری کے خلاف جذبات شدت سے ابھر رہے ہیں لیکن بہت کم لوگوں کی نگاہ اس طرف اٹھتی ہے کہ سب سے زیادہ شدید "سرمایہ دار" طبقہ تو مذہبی پیشوائیت کا ہے۔ سرمایہ دار کا یہی جرم ہے کہ وہ خود محنت نہیں کرتا اور دوسروں کی محنت کی کمائی پہ عیش کرتا ہے۔ لیکن اسے اس کے لئے کچھ سرمایہ لگانا (INVEST کرنا) پڑتا ہے۔ اس کے برعکس مذہبی پیشوائیت ہے کہ ایک پیسہ (INVEST) کئے بغیر دوسروں کی محنت کی کمائی پہ عیش کی زندگی بسر کرتا ہے۔ سمجھئے! اس قسم کی سرمایہ داری کی مثال کہیں اور بھی ملتی ہے؟

دین اور مذہب کی کش مکش

قرآن کریم، دین اور مذہب کی اس کش مکش کے متنوع گوشوں کو بار بار سامنے لا کر اس کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ وہ اس کش مکش کی ابتدا حضرت نوحؑ کی اس انقلابی دعوت سے کرتا ہے جس کی رُو سے انہوں نے، مذہب کی غیر خدائی قوتوں کی حکومتیت میں جکڑی ہوئی قوم سے کہا کہ: یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۷/۵۹) اے میری قوم کے لوگو! تم، مذہب کے ان اجارہ داروں کی اطاعت اور حکومتیت کی زنجیروں کو توڑ دو۔ اور صرف ایک خدا کے قوانین کی اطاعت کرو۔ یاد رکھو! اس کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں جس کی اطاعت اختیار کی جائے۔

بات کس قدر صاف اور واضح تھی لیکن انہوں نے نہ تو اسے قبول ہی کیا اور نہ ہی اس کی تردید میں کوئی دلیل اور برہان پیش کی۔ کہا تو صرف اتنا کہ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ

اٰبَآءَنَا الْاَوَّلِيْنَ ۝ (۲۳/۸۳) ہم نے اپنے آباؤ اجداد میں سے کسی سے یہ بات نہیں سنی اس لئے ہم اسے سننے کے لئے تیار نہیں۔ یعنی یہ نہیں کہ جو بات تم کہتے ہو اس میں ہمارے نزدیک یہ غلطی اور یہ سقم ہے بلکہ یہ کہ جس راستے کی طرف تم بلاتے ہو، چونکہ ہمارے اسلاف اس راستے پر نہیں چلا کرتے تھے اس لئے ہم بھی اسے اختیار نہیں کر سکتے۔ ہم اسی روش پر چلتے جائیں گے جس پر وہ چلا کرتے تھے۔

حضرت نوحؑ کے بعد ہم حضرت صالحؑ کو دیکھتے ہیں کہ وہ بھی اپنی قوم سے یہی کہتے ہیں کہ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ط..... (۱۱/۶۱) اس کے جواب میں وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ اَتَنْهٰنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا..... (۱۱/۶۲) جن معبودوں کی پرستش ہمارے آباؤ اجداد کیا کرتے تھے، تو ہمیں ان کی پرستش سے روکتا ہے؟

حضرت صالحؑ

یعنی وہی آباء جنہوں نے حضرت نوحؑ کے زمانے میں صحیح روش اختیار کرنے سے انکار کر دیا تھا، اب ان کے لئے دلیل اور سند بن گئے!

اس کے بعد ہمارے سامنے حضرت ابراہیمؑ آتے ہیں۔ وہ اپنے باپ اور قوم سے کہتے ہیں مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ۝ (۲۱/۵۲) ان مورتیوں کی حیثیت کیا ہے جن کے سامنے تم جھکتے ہو؟ تم انہیں اپنے ہاتھوں سے تراشتے ہو اور پھر ان کے حضور سجدہ ریز ہو جاتے ہو؟ سوچو کہ اس روش میں عقل اور انسانیت کی کوئی رمق تک بھی ہے؟ اس کے جواب میں انہوں نے بھی وہی کہا جو ان سے پہلوں نے کہا تھا۔ (اَبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ۝ (۲۱/۵۳) انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنے اباؤ اجداد کو انہی کی پرستش کرتے دیکھا ہے، اس لئے ہم بھی ان کی پرستش کرتے ہیں۔ ہم اپنے اسلاف کے راستے کو چھوڑ کر کوئی اور راستہ اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس کے جواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو غصہ تو بہت آیا (اور ہر سمجھ دار کو غصہ آئے گا) لیکن ان عقل کے اندھوں سے اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا تھا کہ: لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (۲۱/۵۴) تم اور تمہارے اسلاف کس قدر کھلی ہوئی گمراہی میں تھے! لیکن "کھلی ہوئی گمراہی" تو اسے ہی نظر آ سکتی ہے جو اپنی آنکھوں سے کام لے۔ جو آنکھیں بند کئے دوسروں کے پیچھے چلا جا رہا ہو اسے غلط اور صحیح راستے میں تمیز کسطرح ہو سکتی ہے۔ قوم مدین کیطرف

حضرت شعیبؑ

حضرت شعیبؑ آئے اور انہوں نے ان سے کہا کہ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ط..... (۱۱/۸۴) اطاعت اور محکومی صرف خدا کے قانون کی ہو سکتی ہے۔ اس کے سوا کائنات میں کوئی اور صاحبِ اقتدار و

اختیار نہیں۔ اس کے جواب میں ان کی قوم کیا کہتی ہے؟ وہی جو ان سے پہلے کفر کے اندھے کہتے تھے، قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ (۱۱/۸۷) اے شعیبؑ! کیا تمہاری صلوٰۃ تمہیں اس کا حکم دیتی ہے کہ ہم ان کی پرستش چھوڑ دیں، جن کی پرستش ہمارے آباؤ اجداد کرتے تھے۔

حضرت موسیٰؑ

دعوتِ حق و صداقت کے جواب میں یہی کچھ حضرت موسیٰؑ کے مخالفین نے کہا۔ ان کا جواب یہ تھا کہ اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا..... (۱۰/۷۸) کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ہمیں اس راہ سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے۔

یہ تو انبیائے سابقہ کا تذکرہ تھا۔ جب نبی اکرمؐ نے اپنی دعوت پیش کی ہے تو آپؐ کو بھی اس کا یہی جواب ملا جو پہلے انبیاءؑ کو ملا کرتا تھا۔ یعنی حضورؐ کی دعوت پر قوم کے بڑوں نے عوام سے کہا مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ یُّرِیْدُ اَنْ یَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ یَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ ج..... (۳۴/۴۳) یہ شخص چاہتا ہے کہ جن معبودوں کی پرستش تمہارے آباؤ اجداد کیا کرتے تھے تمہیں اس راستے سے روک دے۔ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ..... (۳۸/۷) جو کچھ یہ کہتا ہے ہم نے اپنے سابقہ مسلک و مذہب میں ایسا کبھی نہیں

نبی اکرمؐ

سنا۔ اس لئے اس کی بات سچی نہیں ہو سکتی اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ج ..... (۳۸/۷) یہ محض بناوٹ ہے اس کا خود ساختہ دعوے ہے۔ حق و صداقت کا راستہ وہی ہے جس پر ہم اپنے اسلاف کی تقلید میں چلتے آ رہے ہیں۔

غرضیکہ حضرت نوحؑ ہوں یا ہودؑ، حضرت صالحؑ ہوں یا شعیبؑ، حضرت موسیٰؑ ہوں یا نبی آخر الزماںؐ۔ ہر داعیٔ حق و صداقت کو مخالفین کی طرف سے یہی جواب ملتا رہا کہ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ (۴۳/۲۲) ہم نے اپنے اسلاف کو ایک طریق پر چلتے دیکھا ہے۔ اور ہم انہی کے نقشِ قدم پر چلتے جائیں گے، قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰی مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَیْهِ اٰبَآءَكُمْ ط ..... (۴۳/۲۴) ان کے رسول اُن سے کہتے رہے کہ جس راستے کی طرف ہم دعوت دیتے ہیں اگر وہ راستہ تمہارے اسلاف کے راستے سے زیادہ واضح۔ صحیح۔ روشن اور یقینی طور پر منزل کی طرف لے جانے والا ہو۔ تو کیا تم پھر بھی اسلاف ہی کے راستے کو ترجیح دو گے؟ وہ کہتے کہ ہمارے لئے تقابل اور انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ہم کوئی اور بات سننا ہی نہیں چاہتے۔ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ۝ (۴۳/۲۳) ہم نے اپنے اسلاف کو ایک راستے پر چلتے پایا ہے اور ہم انہی کے نقوشِ پا پر آنکھیں بند کئے چلتے جائیں گے۔ ان سے کہا جاتا کہ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ شَیْـًٔا

وَلَا يَهْتَدُونَ ۝ (۵/۱۰۴) اگر صورت یہ ہو کہ تمہارے آباؤ اجداد کو حقیقت کا کچھ علم نہ ہو اور وہ ساری عمر غلط راستے پر چلتے رہے ہوں تو کیا تم پھر بھی انہی کے نقشِ قدم پر چلتے رہو گے؟ جواب ملتا کہ بے شک۔ ہم اسی راستے پر چلتے رہیں گے۔ اس لئے کہ حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ..... (۵/۱۰۴) ہمارے اطمینان کے لئے یہ کافی ہے کہ ہم اپنے آباء کے راستے پر چل رہے ہیں۔ ہمیں اس سے زیادہ کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

قرآن کی دعوت

حضور نبی اکرمؐ خدا کے آخری نبی اور قرآن، خدا کی آخری کتاب تھی، اس لئے دین اور اسلاف پرستی کی اس کشمکش کا قرآن کریم نے تفصیل سے ذکر کیا ہے تاکہ آنے والی نسلوں کو اس کا علم ہو کہ قرآن کی دعوت پیش کرنے والوں کو کس کس قسم کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ قرآن کریم جب ان کی اسلاف پرستی کی روش کی مخالفت کرتا تھا تو اس لئے نہیں کہ اسے ان کے اسلاف سے (خدا واسطے کا) بیر تھا۔ بلکہ اس لئے تھا کہ قرآن اپنی دعوت کو علم و عقل کی بنا پر پیش کرتا تھا اور ان سے کہتا تھا کہ اگر تم اسے مسترد کرتے ہو تو علم و عقل کی رُو سے ایسا کرو۔ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ... (۲/۱۱۱) تم اگر اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو اس کے حق میں دلائل پیش کرو۔ اس سے واضح ہے کہ جسے دین اور مذہب کی کشمکش کہا جاتا ہے، وہ درحقیقت علم و ایقان اور جہالت اور دھاندلی کی کشمکش ہے۔

قرآن کریم اپنے دعاوی کو کسطرح علم و عقل کی رُو سے پیش کرتا ہے اور وہ غور و فکر اور تدبر و شعور کو کسقدر اہمیت دیتا ہے اس پر اس کا ایک ایک صفحہ گواہ ہے۔ (مثلاً) سورۂ اعراف میں ہے۔ وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ ط ..... (۷/۱۷۹)

عقل و فکر سے کام نہ لینے والے

صحرائی اور شہری آبادیوں کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جن کا اندازِ زیست زبانِ حال سے بتاتا ہے کہ یہ جہنمی مخلوق ہے ..... لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا ط أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ط ... (۷/۱۷۹) "یہ وہ لوگ ہیں جو سینوں میں دل تو رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ وہ ماتھے پر آنکھیں بھی رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ ان کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ یہ لوگ دیکھنے میں تو انسان نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت حیوان ہوتے ہیں۔ بلکہ ان سے بھی گئے گذرے ....."

سورۂ انفال میں ہے: إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ۝ (۸/۲۲) "خدا کے نزدیک بدترین خلائق وہ لوگ ہیں جو بہرے اور گونگے بنے رہتے ہیں

یعنی وہ لوگ جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ سورۂ ملک میں ہے کہ جہنم کا داروغہ جہنم میں داخل ہونے والوں سے پوچھے گا کہ تم نے کیا کیا تھا جس کی وجہ سے تم جہنم میں داخل کئے جا رہے ہو؟ وہ جواب میں کہیں گے کہ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِىْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ؁ (۶۷/۱۰) "اگر ہم سچی بات دل کے کانوں سے سنتے اور عقل و فکر سے کام لیتے تو اہلِ جہنم میں سے نہ ہوتے"۔ عقل و فکر سے کام نہ لینا ہے جس کی وجہ سے ہم جہنم میں دھکیلے جا رہے ہیں۔ سورۂ حٰمٓ میں ہے کہ قرآن تو ہے ہی ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہوں۔ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ؁ (۴۱/۳) "قرآن واضح عربی زبان کی کتاب ہے جس کے احکام و حقائق نکھار کر بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن یہ اس قوم کے لئے ہے جو علم و عقل سے کام لے"۔

قرآن کریم تدبّر و تفکر پر بڑا زور دیتا ہے۔ وہ قرآن سے اعراض برتنے والوں کے متعلق کہتا ہے: اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰي قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ؁ (۴۷/۲۴) "یہ لوگ قرآن میں تدبّر نہیں کرتے۔ کیا انہوں نے اپنے دلوں پر (خود ساختہ) تالے ڈال رکھے ہیں؟" (نیز ۴/۸۲) سورۃ النساء میں ہے: اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ؁ (۴/۸۲) "کیا یہ لوگ قرآن میں تدبّر نہیں کرتے۔ اگر یہ فکر و تدبّر سے کام لیتے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اور یہ بھی اس کے منجانب اللہ ہونے کی ایک دلیل ہے"۔ سورۂ صٓ میں ہے: كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ؁ (۳۸/۲۹) "یہ مبارک کتاب ہم نے تیری طرف نازل کی ہے تاکہ لوگ اس میں غور و تدبّر کریں۔ اور صاحبانِ عقل و بصیرت اس سے حقائق پر آگاہ ہوں"۔ سورۃ الرعد میں مختلف مظاہرِ فطرت کا ذکر کرنے کے بعد کہا: اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۱۳/۴) "ان میں ان لوگوں کے لئے حقیقت تک پہنچنے کی نشانیاں ہیں جو عقل و فکر سے کام لیں"۔ سورۂ بقرہ میں معاشی نظام سے متعلق اہم حقائق بیان کرنے کے بعد فرمایا: كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ؁ (۲/۲۱۹) "اس طرح اللہ تمہارے لئے حقائق کو واضح کر کے بیان کرتا ہے تاکہ تم عقل و فکر سے کام لے سکو"۔ اس نے کہا کہ ان سے کہو کہ وہ اندھوں کی طرح بیٹھے نہ رہا کریں۔ دنیا میں چلیں پھریں۔ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ۔ اس سے ان کے دلوں میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں بیدار ہو جائیں گی۔ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ان کے کانوں میں سننے کی استعداد ابھر آئے گی۔ آنکھیں بند کر کے بیٹھے رہنے سے انسان کے ماتھے کی آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں۔ اس سے وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ؁ (۲۲/۴۶)

غور و فکر کی اہمیت کے متعلق قرآن کریم نے ایک مقام پر اس ارتکاز اور جامعیت سے بات کی ہے جسے (ہم سمجھتے ہیں) اس موضوع پر حرفِ آخر کہا جا سکتا ہے۔ نبی اکرمؐ برسوں تبلیغ کرتے رہے لیکن مخالفین نے اس پر بہت کم کان دھرا۔ ایک دفعہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ سے کہا کہ تم ان سے کہو کہ میں تم سے کوئی لمبی چوڑی بات نہیں کہنا چاہتا۔ صرف ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں۔ قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ۔ ظاہر ہے کہ جب کسی سے کہا جائے کہ میں صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں، اور وہ بھی اس قدر مختصر کہ ایک لفظ میں سمٹ جائے۔ تو وہ اسے سننے کے لئے آمادہ ہو جائے گا۔ مخالفین کی اس آمادگی کے بعد فرمایا کہ وہ بات ایسی اہم ہے کہ اسے یونہی چلتے پھرتے نہیں سنا جا سکتا۔ تم میں سے ایک ایک دو دو، جو بھی اسے سننا چاہیں، رُک جائیں۔ ٹھہر جائیں۔ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى جب وہ رُک گئے تو آپ نے ان سے فرمایا کہ وہ بات یہ ہے کہ

تَتَفَكَّرُوْا (۳۴/۴۶)

تم سوچا کرو غور و فکر کیا کرو

اگر تم نے سوچنا شروع کر دیا۔ جو کچھ میں تم سے کہتا ہوں اس پر غور و فکر کرنے لگ گئے تو میرا کام ہو گیا۔ انہوں نے وحیٔ خداوندی پر غور و فکر شروع کر دیا تو نہ صرف اس کی گرویدہ ہو گئی بلکہ وہ امت (قوم) بن گئی جس نے ساری دنیا کے ظلمتکدوں میں علم و عقل کی شمعیں روشن کر دیں انہوں نے اس حقیقت کو پا لیا تھا کہ جسطرح بینائی نام ہے سورج کی روشنی اور انسانی آنکھ کا۔ اسی طرح دین عبادت ہے وحیٔ خداوندی اور عقل انسانی کے امتزاج سے۔

وحیٔ خداوندی + علم و عقل = الدین، الاسلام

انہوں نے قرآن کو اسی طریق سے سمجھا تھا کیونکہ معلم القرآن (علیہ التحیۃ والسلام) کا فریضہ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۶۲/۲) تھا۔ یعنی قوانین خداوندی اور ان کی غرض و غایت (حکمت) کی تعلیم دینا۔ اور ظاہر ہے کہ حکمت (غرض و غایت) عقل و فکر کی رو ہی سے سمجھائی اور سمجھی جا سکتی ہے۔ اس سے علم و عقل کی اہمیت ان کے قلب و دماغ پر نقش ہو چکی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ صاحب علم اور بے علم کبھی ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۹/۹) اس کی شہادت خود خدا نے دی ہے کہ وہ آیات خداوندی کے سامنے بھی اندھے بہرے بنکر نہیں جھکتے تھے۔ انہیں قلب و دماغ کے کامل اطمینان کے بعد، سوچ سمجھ کر، آنکھیں کھول کر تسلیم کرتے تھے۔ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (۲۵/۷۳) اس طرح وحی کے آفتاب اور علم و عقل انسانی کے ماہتاب سے کرۂ ارض جگمگا اٹھا تھا۔ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا ..... (۳۹/۶۹) قرآن کا تو فریضہ یہ تھا کہ وہ نوعِ انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے لِتُخْرِجَ النَّاسَ

مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۵/۱۶)

دورِ ملوکیت

لیکن یہ نورانیت کا دور جلد ختم ہوگیا اور اس کی جگہ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت نے علم و عقل کی شمعیں گُل کر کے، فکرِ انسانی کو تاریکی کی چادروں میں لپیٹ دیا۔ قرآنِ کریم نے سرکش، مستبد، حدود فراموش اربابِ اقتدار (طاغوت) کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ یُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ (۲/۲۵۷) قرآن نوعِ انسان کو تاریکیوں (ظلمات) سے روشنی (نور) کی طرف لاتا ہے۔ ملوکیت انہیں نور سے ظلمات کیطرف لے جاتی ہے۔ لہٰذا جس طرح چمگادڑ سورج کی روشنی کو برداشت نہیں کر سکتا اسی طرح سلاطین علم و عقل کی روشنی سے آنکھیں چراتے ہیں۔ علم و عقل "کیوں" پوچھتے ہیں اور قوت کے بل بوتے پر اقتدار پر قبضہ کرنے والوں کے پاس "کیوں" کا جواب نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ کوشش کرتے ہیں کہ "کیوں" پوچھنے والوں کو ختم کر دیا جائے اور قوم میں کیوں پوچھنے کی استعداد کو سلب کر دیا جائے۔ یہ فریضہ مذہبی پیشوائیت سرانجام دیتی ہے۔ دورِ ملوکیت کے آغاز میں جب اعتراض کیا گیا کہ ایک انسان کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ محض قوت کے زور پر باقی انسانوں کو اپنا غلام بنا لے تو مذہبی پیشوائیت نے انہیں یہ کہکر خاموش کر دیا کہ حکومت خدا کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے (السلطان ظل اللہ علی الارض) ان کے حقِ حکومت پر معترض ہونا منشائے خداوندی کو چیلنج کرنے کے مترادف ہے۔ یہ کفر ہے۔ الحاد ہے۔ ارتداد ہے۔ ان کی کوئی بات تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے، جب یہ خدا کا فیصلہ ہے تو اس میں انسانی عقل کا کیا دخل ہو سکتا ہے؟ ابتداءً تو انہوں نے اس "ڈانٹ" سے کام لیا۔ اور جب اس پر دو چار پشتیں گذر گئیں تو پھر انہوں نے (عہدِ جاہلیت کے اس) ڈھلے ڈھلائے جواب کو پشت و پناہ بنا لیا کہ اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ (۴۳/۲۲) ہم نے اپنے اسلاف کو جس راستے پر چلتے دیکھا ہے ہم اسی راستے پر چلتے جائیں گے۔ اسلاف کی راہ حق و صداقت کی راہ ہے۔ یوں ملوکیت جیسا یکسر خلافِ قرآن نظام عین مطابقِ اسلام قرار دیا گیا۔ اس نے قرآن کو پس پشت ڈالنے کے ساتھ عقل و بصیرت کے چراغوں کو بھی گل کر دیا۔ اور قوم صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ۔ گونگی بہری، اندھی بھیڑوں کا گلہ بن کر رہ گئی۔

مذہبی پیشوائیت

ملوکیت نے مذہبی پیشوائیت کی تائید حاصل کرنے کے لئے ان کے ساتھ بٹوارا کر لیا تھا۔ امورِ مملکت اپنے قبضہ میں رکھے اور امورِ شریعت مذہبی پیشواؤں کی تحویل میں دے دیئے۔ ملوکیت نے مامور من اللہ ہونے کو

قرآن سے پیچھا چھڑانا تھا۔ مذہبی پیشوائیت نے اس کے لئے ایک اور تدبیر سوچی۔ انہوں نے عقیدہ وضع کیا کہ وحی خداوندی، قرآن کے اندر ہی محصور نہیں۔ رسول اللہ کو قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ (مثلہ معہ) اور وحی بھی دی گئی تھی۔ اور وہ حدیثوں کے اندر ہے۔ رسول اللہ نے امت کو صرف قرآن دیا تھا۔ حضورؐ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں لاکھوں صحابہؓ کی موجودگی میں اعلان فرمایا تھا۔ إنّي قد تركت فيكم ما لن تضلوا بعده إن اعتصمتم به كتاب الله (صحاح) میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم نے اسے مضبوطی سے تھامے رکھا تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ وہ چیز کیا ہے؟ کتاب اللہ۔ آپ نے اپنی حدیثوں کا کوئی مجموعہ نہیں دیا تھا۔ نہ ہی اس قسم کا کوئی مجموعہ عہد خلافت راشدہ میں مرتب ہوا تھا۔ اس لیے جعلی حدیثیں وضع کرنے کا میدان کھلا تھا۔ چنانچہ حدیثیں وضع ہوئیں۔ اور لاکھوں کی تعداد میں وضع ہوئیں۔ اس انبار میں سے صحیح اور غلط الگ الگ کرنے کا فریضہ بھی انہوں نے اپنے ذمے لے لیا (اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا)۔ اس طرح انہوں نے خود اپنی صوابدید کے مطابق جن حدیثوں کو صحیح قرار دیا ان کے متعلق فیصلہ کر دیا کہ وہ رسول اللہ کی (وحی پر مبنی) حدیثیں ہیں۔ ان سے انکار تو ایک طرف ان پر کسی قسم کی تنقید بھی انسان کو دائرہ اسلام سے خارج کر دے گی۔ اس طرح (ملوکیت کی طرح) شریعت کے دائرہ میں بھی قرآن کو مہجور اور عقل و فکر کو خارج البلد کر دیا۔ امام بخاریؒ

حدیثوں کے مجموعے

کے مجموعہ کو حدیثوں کا صحیح ترین مجموعہ قرار دیا جاتا ہے۔ امام مرحوم نے لکھا ہے کہ انہیں چھ لاکھ کے قریب حدیثیں ملیں ان میں سے انہوں نے اپنے قیاس اور معیار کے مطابق (مکررات قرآت نکال کر) تین ہزار کے قریب حدیثوں کو منتخب کیا جو ان کے مجموعہ میں داخل ہیں۔ ان میں اور دیگر صحاح میں کس قسم کی حدیثیں ہیں اس کا اندازہ ان چند احادیث سے لگا لیجئے جنہیں نمونۃً درج ذیل کیا جاتا ہے۔

جامع ترمذی میں حضرت عباسؓ کی ایک روایت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ،

> رسول اللہ نے فرمایا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک ۷۱ یا ۷۲، ۷۳ سال کی راہ ہے اور سات آسمان ہیں جن میں سے ہر ایک سے دوسرے کا فاصلہ اسی قدر ہے۔ ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے جس کی گہرائی بھی اتنی ہی ہے۔ اس کے اوپر سات پہاڑی بکرے ہیں جن کے کھروں سے گھٹنوں تک اسی قدر فاصلہ ہے۔ ان بکروں کی پشت پر عرش ہے جس کی موٹائی اسی قدر ہے۔

بخاری شریف کی ایک روایت ہے کہ نبی اکرمؐ سے پوچھا گیا کہ موسم کس طرح بدلتے ہیں۔ کبھی سردی آجاتی ہے کبھی گرمی۔ تو آپ نے فرمایا کہ

دوزخ نے اپنے پروردگار سے شکایت کی کہ اے میرے پروردگار! میرے ایک حصّے نے میرے دوسرے حصّے کو کھا لیا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسے دو مرتبہ سانس لینے کی اجازت دے دی۔ ایک سانس جاڑوں میں، اور ایک گرمی میں۔ پس تم جو سخت سردی دیکھتے ہو تو یہ بھی جہنم کی سانس ہے۔

اسی بخاری میں ہے:۔

حضرت ابوہریرہؓ، نبی (صلعم) سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا۔ ایک گروہ بنی اسرائیل کا کھو گیا۔ مجھے معلوم کیا ہوا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ چوہے وہی ہیں کہ جب ان کے سامنے اونٹ کا دودھ رکھا جاتا ہے تو وہ نہیں پیتے اور جب ان کے سامنے بکریوں کا دودھ رکھا جاتا ہے تو وہ پی لیتے ہیں۔

اسی کی ایک اور روایت:۔

حضرت ابوہریرہؓ، نبی (صلعم) سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔ بنی اسرائیل برہنہ غسل کیا کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھتا۔ اور حضرت موسیٰؑ تنہا غسل کیا کرتے تھے۔ تو بنی اسرائیل نے کہا کہ واللہ! موسیٰؑ کو ہم لوگوں کے ساتھ غسل کرنے سے سوا اس کے کچھ مانع نہیں کہ وہ فتق میں مبتلا ہیں۔ اتفاق سے ایک دن موسیٰؑ غسل کرنے لگے اور اپنا لباس پتھر پر رکھ دیا۔ وہ پتھر ان کا لباس لے کر بھاگا۔ اور حضرت موسیٰؑ بھی اس کے پیچھے پیچھے یہ کہتے ہوئے بھاگے کہ "ثوبی یا حجر! ثوبی یا حجر!!" اے پتھر! میرے کپڑے دے دے۔ یہاں تک کہ بنی اسرائیل نے موسیٰؑ کی طرف دیکھ لیا اور کہا کہ واللہ! موسیٰؑ کو کچھ بیماری نہیں۔ اور پتھر ٹھہر گیا۔ موسیٰؑ نے اپنا لباس لے لیا اور پتھر کو مارنے لگے۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم! حضرت موسیٰؑ کی مار سے اس پتھر پر چھ یا سات نشان اب تک باقی ہیں[1]

یہ (اور اسی قسم کی دیگر) روایات زبانِ حال سے کہہ رہی ہیں کہ رسولؐ اللہ کی طرف ان کی نسبت صحیح نہیں۔ یہ وضعی ہیں۔ لیکن جب ان کے متعلق یہ کہا گیا تو جواب ملا:

اللہ کے وہ بندے جنہوں نے صدقِ دل سے کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھا ہے وہ اس قسم کی کٹ حجتی نہیں جانتے۔ وہ تو خدا اور رسولؐ کے ہر فرمان پر بلا چون و چرا ایمان لاتے، انہیں تسلیم کرتے اور ان میں اپنی عقل لڑانے کو حرام سمجھتے ہیں۔ چنانچہ آج تک کے سلف صالحین، محدثین، مفسرین اور شارحین

---

[1] ان روایات کے حوالوں کے لئے ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب "مقامِ حدیث" دیکھئے

میں سے کسی ایک نے بھی اس حدیث نبویؐ پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ وہ اسے من و عن مانتے چلے آئے۔ بعد والوں کا بھی یہی فرض تھا کہ وہ اس میں اپنے عقلی گھوڑے دوڑانے کے بجائے آمنّا و صدقنا کہتے۔ خدا اور اس کے رسول کی باتوں میں اپنی عقل کو داخل کرنا ایک مسلمان کی شان کے منافی ہے۔

(اہلحدیث کا جریدہ الاعتصام بابت ۷، مارچ ۱۹۸۰ء)

آپ نے غور فرمایا کہ اس جواب کا مفہوم کیا ہے؟ یہ کہ

۱۔ جن روایات کو نہ خدا نے نازل کیا۔ نہ رسولؐ اللہ نے امت کو دیا۔ امام بخاریؒ نے انہیں اپنے قیاس کی رُو سے صحیح سمجھا۔ انہیں خدا اور رسول کے فرامین قرار دے دیا۔

۲۔ ان کے صحیح ہونے کی سند یہ ہے کہ اسلاف نے ان پر اعتراض نہیں کیا۔

۳۔ ان میں عقل و فکر سے کام لینا حرام ہے۔

یہ حضرات اپنے "بسم اللہ کے گنبد" میں بیٹھے مست رہتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ اس قسم کی روایات کی رُو سے غیر مسلم حضورؐ نبی اکرم کی سیرت طیبہ کے متعلق کس قسم کا تصور پیش کرتے ہیں۔ لیکن انہیں اس سے کیا غرض؟ اگر اس سے حضورؐ کی سیرت اقدس (معاذ اللہ) داغدار ہوتی ہے تو ہوا کرے۔ (بلکہ اس عقیدہ کی رُو سے کہ یہ روایات وحی پر مبنی ہیں، خود خدا بھی (معاذ اللہ) لپیٹ میں آجاتا ہے تو آیا کرے)۔ لیکن امام بخاریؒ کے متعلق یہ نہ کہا جائے کہ انہوں نے اپنے مجموعہ میں کمزور روایات کو شامل کر لیا ہے: (مولانا ابوالکلام آزادؒ (مرحوم) نے اسی قسم کی ایک روایت پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا۔

روایات کی قسموں میں کتنی ہی بہتر قسم کی کوئی روایت ہو، بہرحال ایک غیر معصوم راوی کی شہادت سے زیادہ نہیں۔ اور غیر معصوم کی شہادت ایک لمحہ کے لئے بھی یقینیات دینیہ کے مقابلہ میں تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ ہمیں مان لینا پڑے گا کہ یہ اللہ کے رسول کا قول نہیں ہوسکتا۔ یقیناً یہاں راویوں سے غلطی ہوئی ہے۔ اور الیسا مان لینے سے نہ تو آسمان پھٹ پڑیگا، نہ زمین شق ہو جائے گی۔

(ترجمان القرآن۔ جلد دوم۔ صفحہ ۵)

(ضمناً) احادیث جسطرح جمع ہوئی تھیں اسے تو شہادت بھی نہیں کہا جاسکتا۔ آپ کسی عدالت میں جا کر کہیں کہ اس معاملہ کے متعلق مجھے ذاتی طور پر کچھ علم نہیں۔ میں نے فلاں سے یوں سنا ہے۔ تو آپ کی شہادت (کو قبول کرنا تو ایک طرف) اسے ریکارڈ پر بھی نہیں لایا جائے گا۔ آپ کو کمرۂ عدالت سے باہر نکال دیا جائے گا۔ احادیث کی سرگزشت یہ ہے کہ حضورؐ نبی اکرم کی وفات کے قریب اڑھائی سو سال بعد جامعین احادیث نے، لوگوں سے جو کچھ سنا اسے ضبطِ تحریر میں لے آئے۔ سنانے والے نے کہا کہ اس نے فلاں سے سنا تھا۔

اس نے فلاں سے۔ اس طرح اس دو اڑھائی سو سال کے عرصہ میں پانچ پانچ چھ چھ راویوں کے نام گنا دیئے گئے۔ آپ غور فرمایئے کہ کیا کسی معیار اور قانون کی رُو سے اسے شہادت کہا جا سکے گا؟

بہر حال، اس قسم کی ہیں وہ روایات جنہیں خدا اور رسول کے ارشادات کہہ کر منوایا گیا۔ اس میں نہ قرآن کو دخل دینے دیا، نہ علم و بصیرت کو۔ سند صرف یہ کہ اسلاف ایسا ہی مانتے چلے آئے ہیں۔

تفاسیر اگر یہ وضعی روایات احادیث کے مجموعوں تک ہی محدود رہتیں تو بھی ان توہم پرستیوں کا دائرہ محدود رہتا۔ لیکن خود قرآن کریم کی تفسیر انہی روایات کی رُو سے مرتب ہوئی اور اس کے متعلق عقیدہ یہ وضع کیا گیا کہ یہ خود رسول اللہ کی ارشاد فرمودہ تفسیر ہے۔ اس طرح قرآن مجید بھی ان روایات کے تابع ہو گیا۔ یہ تفاسیر کس قسم کی ہیں، اس کا اندازہ تو ان کے مطالعہ ہی سے لگ سکتا ہے۔ اس مقام پر اس کا صرف ایک نمونہ پیش کرنے پر اکتفا کیا جائے گا۔ تفسیر ابن کثیر نہایت قابلِ اعتماد تفسیر قرار دی جاتی ہے۔ اس میں حضرت نوحؑ کی کشتی کی تفاصیل بھی دی گئی ہیں (جو قرآن میں نہیں)۔ اس میں کہا گیا ہے کہ

> وہ بارہ سو ہاتھ لمبی اور چھ سو ہاتھ چوڑی تھی۔ تین درجوں کی تھی۔ ایک میں جانور اور چوپائے تھے۔ دوسرے میں انسان۔ تیسرے میں پرند۔ جب جانوروں کا گوبر پھیل گیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کی طرف وحی بھیجی کہ ہاتھی کی دم ہلاؤ۔ اس کے ہلاتے ہی اس سے خنزیر، نر اور مادہ نکل آئے اور وہ میلا کھانے لگے۔ چوہوں نے جب اس کے تختے کترنے شروع کئے تو حکم ہوا کہ شیر کی پیشانی پر انگلی لگاؤ۔ اس سے بلی، جوڑا نکلا اور چوہوں کی طرف لپکا۔

کشتی میں جو مخلوق سوار ہوئی تھی اس کے متعلق بھی تفصیل دی گئی ہے۔ لکھا ہے کہ نوحؑ کو حکم خدا ہوا کہ اپنے ساتھ جاندار مخلوق کی ہر قسم کا ایک ایک جوڑا (نر، مادہ) سوار کرا لو۔

> سب سے آخر، گدھا سوار ہونے لگا تو ابلیس اس کی دُم کے ساتھ لٹک گیا۔ جب اس کے دو اگلے پاؤں کشتی میں آ گئے اور اس نے اپنا پچھلا دھڑ اٹھانا چاہا تو نہ اٹھ سکا۔ کیونکہ دُم پر اس ملعون کا بوجھ تھا۔ حضرت نوحؑ جلدی کر رہے تھے۔ گدھا ہر چند چاہتا تھا لیکن پچھلے پاؤں چڑھ نہیں سکتا تھا۔ آخر آپ نے فرمایا۔ آجا! گو تیرے ساتھ ابلیس بھی ہو۔ تب وہ چڑھ گیا اور ابلیس بھی اس کے ساتھ آ گیا

(تفسیر ابن کثیر اردو ترجمہ مولانا محمد جونا گڑھی۔ بارہواں پارہ صفحہ ۱۰۰)

چونکہ یہ تفاسیر ان روایات پر مبنی ہیں جنہیں رسول اللہؐ کی احادیث قرار دیا جاتا ہے اس لئے ان پر کسی قسم کی تنقید کو حضور نبی اکرمؐ کی ذات اقدس کے خلاف (معاذ اللہ) طعن پر محمول کیا جاتا ہے۔

صدرِ اوّل کی اسلامی مملکت کا طریق کار یہ تھا کہ قرآن کریم نے جو احکام اور قوانین متعین طور پر دیئے تھے وہ انہیں نافذ کرنے کے طرق و اسالیب طے کرتی تھی۔ اور جو احکام، اصول و اقدار کی شکل میں دیئے تھے، وہ اپنے زمانے کے حالات و اقتضاآت کے مطابق ان کی جزئیات (بائی لاز) متعین کرتی تھی۔ یہ سب کچھ امت کے مشورہ سے طے پاتا تھا۔ دورِ ملوکیت میں، نہ قرآن باقی رہا تھا نہ امت کا نظام مشاورت۔ اس میں بادشاہ کا حکم قانون کی حیثیت اختیار کر لیتا تھا جس پر کسی قسم کی تنقید نہیں کی جا سکتی تھی۔

فقہ

جہاں تک امور شریعت کا تعلق ہے، مذہبی پیشوائیت نے ان کے متعلق قوانین وضع کرنے کا فریضہ اپنے ذمہ لیا۔ قانون سازی کی مہارت رکھنے والے فقہا (قانون دانوں) نے قوانین وضع کئے۔ انہیں فقہی قوانین کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ان کے قوانین کی بنیاد احادیث پر ہے۔ چونکہ احادیث میں اختلاف تھا اس لئے ان فقہی قوانین میں بھی اختلاف تھا۔ ان فقہا کی تعداد تو بہت تھی لیکن ان میں چار نے زیادہ شہرت حاصل کی۔ یعنی امام ابو حنیفہ۔ امام شافعی، امام مالک، امام احمد بن حنبل (رحمہم اللہ تعالیٰ)۔ ان کی فقہیں متداول چلی آرہی ہیں (اور امت میں تفرقہ کا ایک موجب یہ بھی ہیں)۔ شروع میں تو ان میں افہام و تفہیم کی گنجائش تھی لیکن ان کی بنیادوں پر مختلف فرقے وجود میں آگئے تو یہ سب فقہیں اپنی اپنی جگہ محکم اور غیر متبدل قرار پا گئیں۔ آہستہ آہستہ یہ عقیدہ بھی قائم ہو گیا کہ ہر فرقہ کی فقہ اپنی جگہ غیر متبدل اور ابدی ہے۔ یعنی اس میں نہ کسی قسم کا ردو بدل ہو سکتا ہے نہ حک و اضافہ۔ جب فقہا نے یہ قوانین مرتب کئے تھے تو انہوں نے اپنے زمانہ کے حالات کے "تقاضوں" کو مد نظر رکھ کر، غور و فکر کی رو سے انہیں وضع کیا ہو گا۔ لیکن جب یہ طے پا گیا کہ ان میں نہ ردو بدل ہو سکتا ہے نہ حک و اضافہ تو سوچ بچار اور غور و فکر خارج از بحث ہو گئے۔ بطور اصطلاح اب یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ جس قدر اجتہاد کیا جانا مطلوب تھا، اسلاف اسے کر چکے ہیں، اب انہی کے فیصلے قولِ فیصل اور حرفِ آخر تسلیم کئے جائیں گے۔ یہ عصبیت کس حد تک شدت اختیار کر چکی تھی اس کا اندازہ ایک تاریخی واقعہ سے لگایئے: دمشق کی جامع مسجد (جو بنی امیہ کے زمانے میں تعمیر ہوئی تھی) اپنے عہد کی سب سے بڑی مسجد تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد انجینئروں کی ایک جماعت نے حسابی قاعدہ سے جائزہ لیا تو دیکھا کہ مسجد کا رخ کعبہ کی سمت

نہیں۔ اس سے کچھ ہٹا ہوا ہے۔ انہوں نے تجویز کیا کہ اس کا رخ سیدھا کر دیا جائے۔ علماء کرام نے اس مسئلہ پر بحث کی اور کہا کہ اگر انجینئروں کی بات کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس سے یہ ماننا پڑیگا کہ ہمارے اسلاف نے جو نمازیں پڑھی تھیں وہ باطل تھیں۔ لہٰذا ہم چند انجینئروں کے کہنے پر اسلاف کے متعلق ایسا تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ درست وہی ہے جو اسلاف نے کیا۔ اور ہمارے لئے کل خیر فی اتباع السلف۔ عمل خیر سلف کے اتباع میں ہے۔ چنانچہ مسجد کا رخ ویسے کا ویسا ہی رہنے دیا گیا اور اس کے بعد جتنی مسجدیں بھی اس مسجد کے رخ پر تعمیر ہوئیں ان کی سمت بھی کعبہ سے ہٹی رہی۔ یہ ہوتا ہے اسلاف پرستی میں جس کے خلاف قرآن نے اس شد و مد سے جہاد کیا تھا۔

ہم نے دیکھا ہے کہ احادیث کے متعلق یہ عقیدہ وضع کیا گیا تھا کہ (مثلہ معہ) وہ قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل ہیں۔ فقہ کے متعلق بھی اسی قسم کا عقیدہ ہے۔ الھدایہ، فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہے۔ اس کے متعلق احناف کا عقیدہ ہے کہ الھدایہ کالقرآن، ہدایہ قرآن کی مثل ہے۔ لہٰذا قرآن کی ضرورت نہ اہلحدیث کو رہی، نہ اہل فقہ کو۔ ان کے بکثرت قوانین قرآن کے خلاف ہیں۔ اور ان کے نزدیک یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ حنفی فقہ کے پیشوا اور مسلم امام ابوالحسن عبیداللہ الکرخی کا قول ہے کہ

> ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں وہ یا تو مؤول ہے یا منسوخ ہے۔ اور اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ہو وہ مؤول یا منسوخ ہے۔ (تاریخ فقہ اسلامی۔ علامہ الخضری۔ اردو ترجمہ صفحہ ۲۲۱)

یعنی اگر فقہ حنفی کا کوئی قانون قرآن کی آیت کے خلاف ہو، تو قرآن کی آیت کی ایسی تاویل کی جائے جس سے وہ فقہ کے قانون کے مطابق ہو جائے۔ اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر قرآن کی آیت کو منسوخ سمجھا جائے۔ حکم بہر حال قانون فقہ ہی کا نافذ ہوگا۔

یہ رہا فقہ کا قرآن کے ساتھ تعلق۔ جہاں تک عقل و فکر کا سوال ہے اس کا اندازہ اس ایک مثال سے لگائیے کہ اگر کسی عورت کا شوہر مفقود الخبر ہو جائے تو فقہ حنفی کا فیصلہ ہے کہ اسے نوے (۹۰) سال تک اس کی واپسی کا انتظار کرنا چاہیئے۔

علم و عقل کے خلاف جہاد

دور ملوکیت میں قرآن تو امت کے ہاں سے مہجور (ترک) ہو چکا تھا۔ ملوکیت اور ارباب شریعت دونوں کو عقل و فکر کی طرف سے خطرہ لاحق رہتا تھا۔ اس دور کا عام معمول ہو گیا تھا کہ جہاں کہیں قرآن کا نام سننے میں آتا، یا علم و عقل کی ذرا سی بھی کرن دیکھنے میں، تو مذہبی عدالتوں سے کفر و ارتداد کے فتوے صادر ہو جاتے اور پھر ان "مجرموں" کو اس قسم کی عقوبات کا ہدف بنا دیا جاتا جن کے

تصور سے روح پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ ان شخصی اذیت رسانیوں کے علاوہ، مذہبی پیشواؤں کی کیفیت یہ تھی کہ انہیں جن دانشوروں سے بھی اختلاف ہوتا ان کی تصنیفات کا ایک ایک ورق تلاش کر کے تلف کر دیا جاتا۔ مثلاً ابو مسلم اصفہانی نے تیرہ جلدوں میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی، ابو القاسم بلخی نے بارہ جلدوں میں تفسیر مرتب کی انہیں اور اس نہج کے دیگر علماء کو معتزلہ قرار دیا گیا۔ نتیجہ یہ کہ ان کی تفاسیر اور دیگر تصانیف آج سب ناپید ہیں۔ ان کے صرف بعض اقوال امام رازی وغیرہ کی تفاسیر میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ خود امام رازیؒ کو (بھی اس جرم کی پاداش کہ وہ عقل کی باتیں کرتے تھے) دار و گیر کا سامنا کرنا پڑا اور انہیں روپوش ہو کر اپنی جان بچانی پڑی۔ ابن رشد کو فلسفہ کے جرم میں پہلے نظر بند کیا گیا، پھر جلاوطن۔ اور ان کی کتابیں جلا دی گئیں۔ ابن حبان کو اتنی سی بات پر جلاوطن کر دیا گیا کہ انہوں نے کہا تھا کہ "خدا محدود نہیں۔ ہر جگہ موجود ہے۔" بعض مستشرقین نے تاریخ کی ان خونچکاں داستانوں کو مرتب کیا ہے۔ مشہور فرانسیسی مورخ رینان اس باب میں لکھتا ہے:۔

سنہ ۱۱۵۰ء میں خلیفہ المستنجد کے حکم سے ایک قاضی (رجح) کے کتب خانے میں جس قدر فلسفہ کی کتابیں تھیں، خاص کر ابن سینا اور اخوان الصفا کی تصنیفات سب کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ ربی یہودا جو میمون کا شاگرد تھا اس منظر کا عینی شاہد تھا۔ اس نے کہا کہ میں نے ایک مولوی کے ہاتھ میں ابن الہیثم کی ہیئت کی ایک کتاب دیکھی۔ ان دوائر کو دکھا کر جن سے ابن الہیثم نے افلاک کے کروں کو نمایاں کیا تھا، مولوی صاحب نے کہا۔ یہ دیکھو کس قدر رنج کی بات ہے کس قدر آفت ہے کتنی بڑی مصیبت ہے۔ اور کتاب کو پھاڑ کر آگ میں پھینک دیا۔۔۔۔۔

فخر الدین ابن الخطیب رازی پر بغداد میں مصائب ٹوٹ پڑے۔ وہ محققانہ فلسفہ کا پیرو تھا۔ اس نے ارسطو اور ابن سینا پر شرحیں لکھی تھیں اس کے انتقال کے بعد لوگوں نے اس کے مکان میں ایسے اشعار پائے جن میں قدم عالم اور حدوث روح انسانی کے مضامین درج تھے، عوام کو معلوم ہوا تو قبر کھود کر اس کی خاک اڑا دی۔ مقری کہتا ہے کہ ابن حبیب اشبیلوی کو اس لئے سزائے موت دی گئی کہ وہ فلسفہ پڑھا کرتا تھا۔ اسپین میں، حاجب المنصور نے جو حکم کے بیٹے ہشام کے زمانے میں برسرِ اقتدار آیا حکم کے کتب خانے سے وہ تمام کتابیں چھانٹ کر نذرِ آتش کر دیں جن کا تعلق علوم و فنون اور فلسفہ سے تھا۔

(مولانا) شبلی نعمانی مرحوم اپنے مقالات میں لکھتے ہیں:۔

غزالی نے مذہب اشعری کی تائید و نصرت میں بہت سی کتابیں لکھیں اور معتزلہ[1] کی تکفیر و تفسیق کی۔ چونکہ اس وقت عباسیوں کی سلطنت برائے نام رہ گئی تھی اور سلجوقیہ وغیرہ کی وجہ سے مذہبی آزادی باقی نہ رہی تھی۔ اشعری مذہب کی ترویج کے ساتھ اعتزال کے جبراً مٹانے کی کوشش کی گئی۔ معتزلیوں پر بڑا ظلم کیا جاتا تھا اور ان کو اپنے خیالات کے اظہار کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔ محمد بن احمد جو بہت بڑے معتزلی عالم گزرے ہیں اور انہوں نے ۴۷۸ھ میں انتقال کیا، پچاس سال تک گھر سے نہیں نکل سکے۔ علامہ زمخشری، جن کی تفسیر کشاف گھر گھر پھیلی ہوئی ہے، چونکہ معتزلی تھے اپنے ملک میں چین سے رہنے نہیں پاتے تھے، مجبوراً مکہ چلے گئے۔

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:-

مسلمانوں میں علوم کی بنیاد مذہب کی زمین پر رکھی گئی تھی اور اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مذہبی پیشواؤں کی اجتہادی رائیں جدھر کا رخ کریں، علوم بھی ان کا ساتھ دیں۔ اسی وجہ سے مملکت اسلامی کے ہر گوشے میں رہ رہ کر فلسفے کو صدمے اٹھانے پڑتے تھے۔ معتضد باللہ عباسی نے جو ۲۷۹ھ میں تخت نشین ہوا، پہلے ہی سال فرمان نافذ کیا کہ کتب فروش فلسفے کی کتابیں نہ بیچیں۔ (بحوالہ طلوع اسلام، اگست ستمبر ۱۹۶۴ء۔ صـ۴۲)

یہ تھا وہ ورثہ جسے اس امت نے اپنے اسلاف سے پایا تھا۔ یعنی

۱۔ **ملوکیت** | چونکہ شاہنشاہیت اور مذہبی پیشوائیت، دونوں نے عقل و بصیرت کا گلا گھونٹ دیا تھا اس لئے امت، بیک وقت، ایسے ایسے متضاد عقائد اور مسالک کی حامل تھی کہ اگر اسے سوچنے کی ذرا بھی اجازت (یا صلاحیت) باقی ہوتی تو بادنیٰ تدبر ان کا تضاد نکھر کر سامنے آجاتا۔ (مثلاً) اسی ملوکیت کو لیجئے۔ یزید کو (متفقہ طور پر) مطعون اور، شارح عقائد نسفی، علامہ تفتازانی کے مطابق ملعون) اس لئے قرار دیا جاتا ہے کہ اس نے حکومت، امت کی تصویب کی رو سے نہیں بلکہ قوت یا وراثت سے حاصل کی تھی۔ یزید کے بعد آج تک مسلمانوں میں جتنے بادشاہ بھی گذرے ہیں (اور اب بھی ہیں)، انہوں نے حکومت اسی طرح حاصل کی تھی جس طرح یزید نے۔ یزید کے متعلق وہ عقیدہ، اور ان تمام سلاطین کے حق میں، منبر و محراب سے دعائیں۔ دعائیں

---

[1] معتزلہ کا مسلک قرآن اور عقل تھا۔ اشعری ان کے مدمقابل تھے۔

بادشاہوں کے حق میں قصیدے

اور نیک تمنائیں ہی نہیں الیافعی نے اپنی تاریخ میں یزید بن عبدالملک کے عہد کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ :

چالیس شیوخ نے آکر گواہی دی کہ خلقاء قیامت کے دن بغیر حساب کتاب بخشے جائیں گے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی (مرحوم) اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

اسی دنوں محدثین کا ایک بڑا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس نے اس عقیدہ کو اپنا دین بنا لیا تھا۔ چنانچہ ابوبکر جصاص اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ان لوگوں کا اس کے ساتھ یہ بھی خیال تھا کہ ظلم وجور اور بے گناہ لوگوں کے قتل وغیرہ کا صدور بادشاہِ وقت سے اگر ہو تو اس کے خلاف آواز بلند کرنا شرعاً صحیح نہیں۔ (احکام القرآن - جصاص - بحوالہ امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی از مولانا گیلانی مرحوم)

امام جصاص حنفی تھے، اور فقہ حنفی میں یہ فتویٰ اب بھی موجود ہے کہ

سربراہِ مملکت، جس کے اوپر کوئی اور صاحب اقتدار نہ ہو، جرم قتل کے سوا کوئی جرم بھی کرے، اس پر حد نافذ نہیں ہو سکے گی۔ (ہدایہ اولین - مجیدی ص۴۹۲)

یعنی ایک ہی سانس میں یزید کو ہدفِ سب وشتم بنایا جاتا ہے اور دوسری طرف اسیطرح اقتدار حاصل کرنے والے حکمرانوں کو (اسی دنیا میں ہی نہیں قیامت میں بھی) مغفور و معصوم قرار دیا جاتا ہے اور ان کے حق میں ایدہ اللہ بنصرہ اور خلد اللہ ملکہ کی دعائیں مانگی جاتی ہیں ملوکیت کے استبداد نے قوم کی جرأتیں مفقود اور سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں مسلوب کر دی تھیں ورنہ بادنیٰ تدبر یہ بات نکھر کر سامنے آ جاتی کہ بیک وقت اس قسم کے متضاد عقائد کس طرح رکھے جا سکتے ہیں۔

۲- مذہبی پیشوائیت

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے۔ ان حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ اسلام نام ہے اتباعِ سلف کا۔ اس میں نہ قرآن کا دخل ہو سکتا ہے، نہ عقل کا کوئی واسطہ۔ چنانچہ کچھ عرصہ پہلے مدینہ یونیورسٹی کے صدر نے اعلان کیا تھا کہ

زمین ایک جگہ پہ قائم ہے اور سورج اس کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے خلاف تصور کرے تو اسے پھانسی پہ لٹکا دینا چاہیئے۔

(بحوالہ طلوعِ اسلام اگست ۱۹۶۶ء)

اور لاؤڈ سپیکر کی ایجاد پہ دیوبند کے مفتی اعلیٰ (مولانا) محمد شفیع (مرحوم) نے فتویٰ دیا تھا کہ اس کا استعمال شرعاً ناجائز ہے (اور فتویٰ دیا تھا ایک ہندو سائنس ماسٹر کی تحقیق کی رو سے) یہ حضرات اپنے فتاویٰ کی تائید میں اسلاف میں سے کسی کا قول نقل کر دیتے ہیں اس لئے

اس کے خلاف کچھ کہا ہی نہیں جا سکتا۔ اس باب میں قرآن کچھ کہے۔ علم و عقل کی روشنی کسی نتیجہ پر پہنچائے۔ علوم فطرت کی تحقیقات کا کچھ ہی فیصلہ ہو۔ آپ نے ایک لفظ بھی اس فتویٰ کے خلاف کہا اور آپ پر کفر و الحاد کے فتوے لگ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے جب قرآن کریم میں غور و تدبر کا حکم دیا تھا تو وہ حکم نہ کسی خاص زمانے تک محدود تھا نہ کسی خاص گروہ میں محصور۔ وہ حکم تمام مسلمانوں اور ہر زمانے کے لئے عام تھا۔ جب قرآن قیامت تک کیلئے ضابطۂ راہنمائی ہے تو اس پر غور و فکر کے دروازے بھی ہمیشہ کے لئے کھلے رہنے چاہئیں۔ لیکن مذہبی پیشوائیت کا فیصلہ ہے کہ قرآن پر جس قدر غور و فکر کیا جانا تھا، اسے اسلاف کر چکے ہیں۔ اب کوئی مزید فکر نہیں کر سکتا۔ قرآن کریم کی وہی تفسیر و تشریح مستند اور اسلامی سمجھی جائے گی جو اسلاف کی تفاسیر کے مطابق ہو۔ انتہا یہ کہ ان کے ہر فرقہ کے نزدیک قرآن کریم کی وہی تفسیر قابلِ قبول ہو سکتی ہے جو اس فرقہ کے معتقدات کے مطابق ہو۔ کچھ عرصہ ہوا۔ دارالعلوم دیوبند کے مدرس (مولانا) سید انظر شاہ نے تفسیر مدارک کا اردو ترجمہ شائع کیا۔ اس کے تعارف میں لکھا تھا۔

حنفی تفسیر قرآن

صدیوں سے ہمارا سرمایۂ حدیث و تفسیر گروہی عصبیت کا تختۂ مشق ہے۔ یعنی تفاسیر و احادیث کے مجموعے شافعی المذہب علماء کے قلم سے تیار ہوتے رہے ..... بہر حال جو کچھ ہو چکا ہے اس کا تدارک اس کے سوا اور کیا ہے کہ خاص حنفی نقطۂ نگاہ سے بھی قرآن مجید کی تفسیر ہو۔

(طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۶۹ء صـ۴۱)

یعنی فقہ و حدیث تو ایک طرف، قرآن بھی ساری امت کا مشترک نہ رہا۔ ہر فرقہ کا الگ الگ ہو گیا اور اس کی سند یہی کہ اس فرقہ کے اسلاف نے جس طرح قرآن کی تفسیر کی ہے وہی مستند اور قابلِ قبول ہے۔

نظامِ سرمایہ داری

ملوکیت اور نظامِ سرمایہ داری کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مذہبی پیشوائیت نے جہاں ملوکیت کے ساتھ سمجھوتہ کیا، نظامِ سرمایہ داری کو بھی سندِ جواز عطا کر دی۔ ان کا فیصلہ ہے کہ۔

اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت، جب کہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق اور واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلا حدّ و نہایت رکھی جا سکتی ہے۔ روپیہ پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرضیکہ کسی چیز کے معاملہ

ہیں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں، پھر آخر تنہا زرعی جائیداد ہی میں وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بنا پر صرف اس کے معاملہ میں شریعت کا میلان یہ ہو کہ اس کے حقوق ملکیت کو مقدار کے لحاظ سے محدود کر دیا جائے یا انتفاع کے مواقع سلب کر کے ایک حد خاص سے زائد ملکیت کو آدمی کے لئے عملاً بیکار کر دیا جائے۔

ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں:

جس طرح (اسلام) ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار۔ اتنے مویشی، اتنی موٹریں اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو، اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔ پھر جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم صرف اتنی تجارت یا صنعت یا دوسرے کاروبار کے مالک ہو سکتے ہو جسے تم براہ راست خود کرو۔ اور جس طرح اس نے دنیا کے کسی دوسرے معاملہ میں ہم پر یہ قید نہیں لگائی ہے کہ تم کسی ایسے کام پر حقوق ملکیت نہیں رکھ سکتے جس کو تم اجرت یا شرکت کے طریقے پر دوسروں کے ذریعے کر رہے ہو، اسی طرح وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بس وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے۔ اور یہ کہ اجرت یا شرکت پر کاشت کرنے والوں کو سرے سے زمین پر حقوق ملکیت حاصل ہی نہیں ہیں۔ اس قسم کی قانون سازیاں خود مختار لوگ تو کر سکتے ہیں لیکن جو خدا اور رسول کے مطیع فرمان ہیں، وہ ایسی باتیں سوچ بھی نہیں سکتے۔

(سید ابو اعلیٰ مودودی مرحوم۔ مسئلہ ملکیت زمین۔ سن ۱۹۵۰ء ایڈیشن۔ صت ۵۲-۵۳)

یعنی نظام سرمایہ داری کی انتہائی جذامی شکل عین مطابق اسلام قرار پا گئی اور مزارعت' مضاربت، مشارکت جیسا ربٰو حلال و طیب تسلیم کر لیا گیا۔ انبار در انبار دولت جمع کر کے اس میں سے سال کے بعد، چند پیسے خیرات کے طور پر دے دینے کا نام زکوٰۃ رکھ دیا، اور بے حد و نہایت رقبات اراضی میں سے مٹھی بھر غلہ، اللہ کے نام پر دے کر اسے عشر کہہ دیا۔ اور اس خود فریبی (یا خدا فریبی) کے بعد مطمئن ہو کر بیٹھ گئے کہ اسلام کا تقاضا پورا ہو گیا ہے۔ سند اس کی وہی روایات، فقہ اور اسلاف کا مسلک!

اُخروی نظام سرمایہ داری سرمایہ پرستی کے مسلک نے دنیا سے آگے بڑھ کر آخرت کو بھی متاثر کر دیا۔ قرآن کا تصور حیات اجتماعی تھا۔ آپ

سارے قرآن میں دیکھ جائیے۔ مومن (ایک فرد) کہیں بھی اپنے لئے کچھ نہیں چاہتا۔ کچھ نہیں مانگتا۔ مومنین کی سب دعائیں اجتماعی ہیں۔ وہ دنیاوی حسنات کے لئے بھی "اٰتنا" کہتا ہے (یعنی ہمیں عطا فرما) اور اُخروی حسنات کے لئے بھی "اٰتنا"۔ وہ جنّت کے متعلق کہتا ہے کہ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ (۸۹/۲۹-۳۰) "میرے بندوں کے ساتھ مل جا اور جنّت میں داخل ہو جا"۔

سرمایہ داری ذہنیت انفرادیت (INDIVIDUALISM) سکھاتی ہے۔ یعنی اس میں ہر فرد۔ سود خود بیند نہ بیند سودِ غیر۔ مذہب میں آپ دیکھئے۔ ہر فرد اپنی اپنی نجات کی فکر میں غلطاں و پیچاں نظر آئے گا۔ "الٰہی! مجھے بخش دے۔ یا خدا! مجھے جنّت عطا فرما"۔ یعنی امّت، فرقوں میں بٹ گئی، اور فرقے افراد میں تقسیم ہو گئے۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا (۳/۱۰۲) "تم سب کے سب اجتماعی طور پر کتاب اللہ کے ساتھ متمسک ہو جاؤ" کا ارشادِ خداوندی محض تلاوت کے لئے باقی رہ گیا جسے "باجماعت نماز" کہا گیا۔ اس کی اجتماعیت اس سے زیادہ کچھ نہ رہی کہ تَحْسَبُھُمْ جَمِیْعًا وَّ قُلُوْبُھُمْ شَتّٰی (۵۹/۱۴) "تم سمجھتے ہو کہ ان میں اجتماعیت پیدا ہو گئی ہے؟ بالکل نہیں۔ وہ صرف ایک جگہ کھڑے ہیں ان کے دل ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔" اقتدار افراد کا۔ مفاد افراد کا۔ نجات افراد کی۔

یہ تھا وہ اسلام جسے مسلمان قوم، صدیوں سے لئے چلی آ رہی تھی، اور جو شخصیتوں کے تقدس کے تعویذوں کے سہارے محفوظ تھا۔ قرآن کریم نے جن اقوامِ سابقہ کی داستانیں بیان کی ہیں، ان سے تو یہی مترشح ہوتا ہے کہ جس قوم کی یہ حالت اس قسم کی ہو چکی ہو وہ مٹ جاتی ہے اور اس کی جگہ کوئی دوسری قوم لے لیتی ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے

سرسید

کہ ہمارا مہلت کا وقفہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا اس لئے ہم میں حیاتِ نو حاصل کر لینے کا امکان تھا۔ اس کی شہادت یہ ہے کہ ہم میں سرسیّد جیسی شخصیت پیدا ہو گئی جس نے مذہب کی جگہ دین کے اصولوں کو اجاگر کیا۔ قرآن میں تدبّر و تفکّر، فطرت کی قوتوں کی تسخیر۔ مختلف علوم کی تحصیل، سکولوں اور کالجوں کا قیام۔ مذہبی پیشوائیت کے لئے یہ انقلابی آواز مہیب خطرہ کی گھنٹی تھی۔ وہ متحدہ محاذ بنا کر اس کے خلاف اٹھے۔ پہلے اپنے ہاں سے کفر اور ارتداد کے فتووں کے تیر چلائے۔ جب وہ کارگر نہ ہوئے تو حجازِ مقدس (مکہ، مدینہ) سے جا کر کفر کے فتوے لائے۔ لیکن سورج اب طلوع ہو چکا تھا۔ چشمِ خفاش کے بس کی بات نہیں تھی کہ اس پر تاریکیوں کے پردے ڈال دے۔ اس کی شعاعیں دور دور تک پھیل رہی تھیں۔ جمال الدین افغانی، ترکی میں سعید حلیم پاشا، مصر میں مفتی عبدہٗ (علیہم الرحمۃ) انہی افکار کو

۱؎ سرسیّد پیامبر اور ہر پیامبر کی طرح اس کی سوچ میں بھی غلطیاں اور کمزوریاں تھیں۔ لیکن جن اصولوں کی طرف اس نے دعوت دی تھی وہ اسلام کے علمبردار تھے۔

لے کر اٹھے تھے۔ لیکن سرسیّد کی آواز سب سے زیادہ مؤثر ثابت ہوئی کہ اس کے بعد یہاں اقبالؒ پیدا ہوگیا جس نے امت کے عروق مردہ میں خونِ زندگی دوڑا دیا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ۔ در ذہنش ملوکیت حرام است۔ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ باقی سب

اقبالؒ

بتانِ آزری ہیں۔ خدا کی یہ حکومت عملاً اس کی کتاب کی حکمرانی کا نام ہے اسی کا نام اسلام ہے۔

گر تو می خواہی مسلمان زیستن   نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اس نے نحیف و نزار، نیم مردہ، سخت جان امت کے امراض کی تشخیص کی اور کہا کہ

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر   سود خوار و والی و ملّا و پیر

اس نے مسلمانانِ عالم کو للکار کر کہا کہ وطنیت کی بنیادوں پر امت کی مختلف قوموں میں تقسیم اسلام کی اصل و اساس کے خلاف ہے بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں نہیں ہے۔ جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے۔ اس لئے ان غیر اسلامی، نسلی، لسانی قومی حدود و قیود کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا۔ نہ ایرانی رہے باقی نہ افغانی نہ تورانی۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے   نیل کے ساحل سے لیکر تا بخاکِ کاشغر

اس نے روس سے کہا کہ تمہارا نظام کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اس لئے کہ اس کی بنیاد بڑی کمزور ہے

ایکہ می خواہی نظامے عالمے   جستۂ اورا اساسِ محکمے

اس نے اہلِ مغرب سے کہا کہ انسانوں کی حکومت کسی شکل میں ہو، ملوکیت ہی ہوتی ہے

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام   جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

غرضیکہ اس نے اس اسلام کے پیغام کو عام کیا جو مشرق و مغرب دونوں کے لئے اعلانِ جنگ تھا۔ مذہبی پیشوائیت نے اس کے خلاف بھی تکفیر و تفسیق کی آواز اٹھائی لیکن اقبالؒ کا صورِ اسرافیل اس قدر غلغلہ انداز اور زلزلہ انگیز تھا کہ اس نقار خانہ میں طوطی کی آواز کو کسی نے سنا ہی نہیں۔

اقبالؒ نے اپنی فراستِ قرآنی سے یہ اندازہ بھی لگا لیا تھا کہ احیائے اسلام کی یہ تحریک اقوامِ مغرب کو کبھی خوش نہیں آ سکتی۔ ان کی طرف سے اس کی مخالفت ہو گی۔ اور سخت مخالفت۔ اس لئے کہ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ اگر قرآنی اسلام مسلم اقوام کا عملی ضابطۂ حیات بن گیا تو ان (مغربی اقوام) کا وجود تک دنیا سے مٹ جائے گا۔ اس نظام کے سامنے دنیا کا کوئی نظام ٹھہر نہیں سکے گا۔ آپ اقبالؒ کے کلام کو شروع سے آخر تک دیکھ جائیے۔ وہ اقوام و تہذیبِ مغرب کے خلاف مسلسل جہاد نظر آئے گا۔ اس سے اقبالؒ کا مقصد اقوامِ مسلم کو اس مہیب خطرہ سے آگاہ کرنا تھا کہ قرآنی اسلام کی سب سے شدید

مخالفت اقوامِ مغرب کی طرف سے ہوگی۔ اس خطرہ سے اپنی حفاظت کا انتظام کرنا۔ یوں تو حضرت علامہ نے اس حقیقت کو مختلف مقامات پر، مختلف پیرایوں میں نمایاں کیا ہے لیکن جس ڈرامائی انداز میں اسے، اپنی آخری کتاب، ارمغانِ حجاز میں، اس نظم میں بیان کیا ہے جس کا عنوان ہے "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" اس کی مثال اسلامی لٹریچر میں کہیں نہیں ملے گی۔ ابلیس اپنے مشیروں کی رپورٹیں ملاحظہ کرنے کے بعد کہتا ہے:

ابلیس کی مجلسِ شوریٰ

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

اس سے خوف کیوں ہے!

الحذر آئینِ پیغمبر سے، سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن مرد آزما، مرد آفریں

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

لہٰذا

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

تم احتیاط برتو اور سخت احتیاط کہ:

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات
ہو نہ روشن اُس خدا اندیش کی تاریک رات

اس کے لئے پروگرام یہ ہے کہ تم اسے اس قسم کے نظری مسائل کی بحثوں میں الجھا لے رکھو کہ

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے
ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عین ذات

آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے
یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات

ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات

کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دور میں
یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات

تم محسوس کر رہے ہوگے کہ میں جس قدر اس "فتنہ" سے خائف ہوں، کسی اور خطرہ سے اس قدر ہراساں کبھی نہیں ہوا۔ یہ اس لئے کہ

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

اس خطرہ سے محفوظ و مامون رہنے کی ایک ہی ترکیب ہے۔ اور وہ یہ کہ:

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

یہ ابلیس کی پکار نہیں۔ مغرب کی سرمایہ پرست اور استعمار پسند اقوام (بالخصوص امریکہ)

کی زرہ گری اور سپاسی پر کاری ہے۔ ابلیس نے اپنے مشیروں کے لیئے وہ پروگرام تجویز کیا تھا۔ اقبالؒ نے اپنے ہمنواؤں سے کہا کہ مسلمانوں کی موجودہ مملکتوں میں سے شاید ہی کوئی اس انقلابی اسلام کو اپنے ہاں نافذ کرنے کی جرأت کرے لہٰذا ہمیں ایک ایسا خطۂ زمین حاصل کرنا چاہیئے جہاں مروجہ اسلام پہلے سے زمین گیر نہ ہو۔ اس میں حقیقی اسلام کو ضابطۂ زندگی بنا دیا جائے۔ اس سلسلہ میں اس نے بار بار متنبہ کیا تھا کہ دیکھنا! اس مملکت میں مروجہ اسلام کے علمبردار، مذہبی پیشوا کسی طرح دخیل نہ ہو جائیں۔ ان سے اس مملکت کو محفوظ رکھنا۔ اقبالؒ نے جو کچھ مُلّا کے خلاف کہا تھا اس سے یہی مقصود تھا اقبالؒ اس تبشیر و تنذیر کے بعد دنیا سے چلا گیا۔

طلوعِ اسلام

پرویز صاحب طبعاً منکسر المزاج واقع ہوئے ہیں اس لئے انہوں نے کبھی بڑھ چڑھ کر یہ نہیں کہا کہ اس خطۂ زمین کے حصول کی تحریک میں، جسے علامہ اقبالؒ نے احیاءِ اسلام کا گہوارہ بنانے کے لئے تجویز کیا تھا انہوں نے کس قدر خدمات سر انجام دی تھیں۔ علامہ اقبالؒ نے جس اسلام کے احیاء کو امت کے امراض کا علاج بتایا تھا۔ اس کا سر چشمہ قرآن تھا۔ پرویز صاحب اتنا ہی کہتے ہیں کہ میں قرآن کا ایک ادنیٰ سا طالب علم ہوں۔ میں نے اس پر غور و فکر اور پھر اسکے ماحصل کی نشر و اشاعت کو اپنی زندگی کا مشن قرار دے رکھا ہے۔ قریب پچاس سال سے میں اس دشت کی سیاحی میں گامزن ہوں۔ تحریکِ پاکستان کے دوران جو نیشنلسٹ علماء، مذہب کی بنیاد پر اس تحریک کی مخالفت کرتے تھے، ان کی مدافعت کی سعادت میرے حصے آئی تھی۔ طلوعِ اسلام کا اجراء اس مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ان کے ساتھ میرا مسلسل ٹکراؤ رہا۔ قصہ کوتاہ، مبداءِ فیض کی کرم گستری سے، ہمیں کامیابی ہوئی اور انہیں شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ میرے خلاف ان کے جذبات بغض و عداوت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ حضرات بڑے فخر سے کہا کرتے ہیں کہ دنیا میں کفر کا سب سے بڑا فتویٰ اس کے (یعنی پرویز صاحب کے) خلاف لگایا گیا تھا جس پر ایک ہزار علماء کے دستخط ثبت تھے۔ (باقی علماء شاید دستخط کرنا نہ جانتے ہونگے اس لئے وہ اس فتویٰ پر دستخط نہ کر سکے) پاکستان آکر ان کے ساتھ پرویز صاحب کی کشمکش کا آغاز شروع ہوئی۔ یہ یہاں اسی اسلام کو نافذ کرنا چاہتے تھے جو اسلاف سے مسلسل چلا آ رہا تھا اور جس کے یہ حضرات اجارہ دار تھے۔ پرویز صاحب قرآنی اسلام کے نفاذ کے داعی تھے۔ (اور ہیں)۔ اور کشمکش کا یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اقوامِ مغرب (بالخصوص امریکہ) کو یہ خدشہ تھا کہ اس نوزائیدہ مملکت

(پاکستان) میں اقبالؒ اور جناحؒ کے تصور کا اسلام نافذ نہ ہو جائے۔ مغرب کی میکیاولی سیاست اپنے مقاصد کی بر آوری کے لئے جس قسم کے حربے استعمال کیا کرتی ہے، نظر آتا ہے کہ

امریکی سازش

وہ ان کی تیاریوں کی فکر میں تھی۔ حکومتِ پاکستان نے جب (۱۹۵۵ء) میں امریکہ کے ساتھ تعلقات وابستہ کرنے کا خیال کیا تو سید ابو الاعلیٰ مودودی (مرحوم) نے حکومت امریکہ سے کھلے بندوں کہا کہ اگر آپ لوگ اس علاقہ میں اپنا اثر و رسوخ قائم کرنا چاہتے ہیں تو اس کا طریقہ یہ نہیں کہ آپ یہاں کی حکومتوں کے ساتھ تعلقات استوار کریں۔ آپ ہم سے بات کریں جو یہاں کے عوام کے حقیقی نمائندے ہیں۔

نظامِ سرمایہ داری دنیا میں اسقدر بدنام ہو چکا ہے کہ کوئی شخص براہِ راست اس کے حق میں پراپیگنڈہ کرنے کی نہ جرأت کرتا ہے نہ اسے مفید پاتا۔ اس کے لئے ٹیکنیک یہ اختیار کی جاتی ہے کہ کمیونزم یا سوشلزم کے نظام کو الحاد اور بے دینی قرار دے کر اس کی خوب مذمت کی جائے۔ جس شدت سے سوشلزم کے خلاف پراپیگنڈہ کیا جائے گا، اسی نسبت سے کیپٹل ازم (نظامِ سرمایہ داری) کی جڑیں مضبوط ہوتی جائیں گی۔ (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) ہمارے علماء حضرات جس اسلام کے قائل ہیں اس کا نظام خالصتہً سرمایہ دارانہ ہے۔ لیکن یہ حضرات اس کے متعلق ایسا کبھی نہیں کہتے۔ کہتے یہ ہیں کہ "اسلام نہ سرمایہ دارانہ نظام کا حامی ہے نہ سوشلزم کا۔ اس کا اپنا نظام ہے"۔ لیکن یہ کبھی نہیں بتائیں گے کہ اس کا اپنا نظام ہے کیا؟ پاکستان میں اس نوعیت کا پراپیگنڈہ مذہبی حلقوں کی طرف سے مسلسل جاری ہے۔ سنہ ۱۹۷۶ء میں سیرت کانگریس منعقد ہوئی تو اس میں یورپ اور امریکہ کے مستشرقین بھی شامل ہوئے تھے۔ یونیورسٹی آف ایڈنبرا کے شعبہ اسلامیات کے پروفیسر، ڈبلیو منٹگمری واٹ نے اس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

> اس وقت نوعِ انسان اخلاقی اور ثقافتی سطح پر ایک نہایت نازک صورتِ حال سے دوچار ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے فرزندانِ توحید کی طرف سے زیادہ سے زیادہ تبلیغ میسر آسکے تاکہ عیسائی اور مسلمان اپنے مشترکہ دشمن "الحاد" کے خلاف مل کر جہاد کر سکیں۔

(بحوالہ طلوعِ اسلام۔ اپریل ۱۹۷۶ء صـ۴۱)

اس کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں یار ناصح　　کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غمگسار ہوتا!

جنوری سنہ ۱۹۷۹ء میں امریکہ کے اس زمانے کے صدر جمی کارٹر کے سب سے بڑے سیکیورٹی ایڈوائزر (BREZINSKI) نے احکام جاری کئے تھے کہ

دنیا بھر میں اسلامی تحریکوں کے اثرات کا جائزہ لیا جائے اس مطالعہ اور جائزہ کا

مقصد یہ ہے کہ حکومت کو مسلمانوں کی مذہبی تحریکوں کے اثرات کے متعلق اس سے بہتر معلومات بہم پہنچائی جائیں۔ جس قدر اسے ایران کے معاملہ میں حاصل ہوئی تھیں۔

(طلوع اسلام اپریل ۱۹۷۹ء صا۳)

نظر آتا ہے کہ ان تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد امریکہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر قرآنی تحریکیں مسلم ممالک میں پھیلتی چلی گئیں تو امریکہ ہی نہیں۔ دنیا میں کسی سیکولر مملکت کا وجود باقی نہیں رہے گا۔ سوچئے کہ اگر دنیا کے ایک ارب کے قریب مسلمان' اگر ایک امت (امت واحدہ) بن جائیں۔ مراکش سے انڈونیشیا تک ایک بحر ذخار کی شکل اختیار کر لیں۔ ان کے سینے میں قرآن تگا پوں میں بصیرت دماغ، علوم و فنون کی روشنی سے منور' اور فطرت کی قوتوں پر ان کا غلبہ ہو تو اس طوفان کی تلاطم خیزیاں ہر مخالف قوت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائیں گی۔ اس کے بعد انہوں نے اس کے علاج کی بابت سوچا تو اس کا سراغ انہیں ہماری تاریخ ہی سے مل گیا۔ جب ایران فتح ہوا تو وہاں کا ایک نامور گورنر ہرمزان قیدی کی حیثیت سے حضرت عمرؓ کے سامنے آیا۔ آپ نے اس سے کہا کہ تمہارے مستقبل کے متعلق تو بعد میں سوچا جائے گا۔ پہلے ایک بات بتاؤ۔ ابھی کل تک تم ایرانیوں کی کیفیت یہ تھی کہ تم ہم عربوں کو اس قدر ذلیل سمجھتے تھے کہ ہم سے (دوستی تو کجا) جنگ کرنا بھی اپنے لئے باعث ننگ خیال کیا کرتے تھے۔ اب بھی تم وہی ایرانی ہو اور ہم وہی عرب ہیں۔ لیکن کیفیت یہ ہے کہ تم ہمارے باتھوں' ہر میدان میں شکست کھاتے ہو۔ تم میرے سامنے پا بجولاں کھڑے ہو اور تمہارا شاہنشاہ اپنی جان بچانے کے لئے مارے مارے پھر رہا ہے۔ میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ اس عظیم تبدیلی کی وجہ کیا ہے؟

اس نے کہا کہ عمر! بات بالکل واضح ہے۔ پہلے جب تم لوگوں کے ساتھ ہماری برد آزمائی ہوتی تھی تو ایک طرف ایرانی ہوتے تھے اور دوسری طرف عرب، عرب تنہا ایرانیوں کا کسی طرح بھی مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اس لئے شکست کھا جاتے تھے۔ اب حالت یہ ہے کہ ان مقابلوں میں ایک طرف تنہا ایرانی ہوتے ہیں اور دوسری طرف عرب اور ان کے ساتھ ان کا خدا ہوتا ہے۔ ان دونوں کا مقابلہ ایرانی کیا' دنیا کی کوئی طاقت بھی نہیں کر سکتی۔ تم خدا کو الگ کر کے ہمارے مقابل میں آؤ۔ پھر دیکھو تمہارا وہی حشر ہوتا ہے یا نہیں۔

ہرمزان نے بات پتے کی کہہ دی۔ مسلمان اور اس کے ساتھ اس کا خدا۔ دنیا کی ہر طاقت پر غالب آ جائیگا۔ وَلَن يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا (۴/۱۴۱) " ایسا کبھی نہیں ہوگا کہ خدا، غیر مسلموں کو مؤمنین پر غالب آنے دے"۔

ایسا نظر آتا ہے کہ اہل امریکہ نے اس راز کو پا لیا اور سمجھ لیا کہ اگر اس امت نے قرآن کو اپنا ضابطہ حیات بنا لیا تو دنیا کی کوئی طاقت ان پر غالب نہیں آ سکے گی۔ اس کے توڑ کے لئے

انہوں نے یہ تدبیر اختیار کی کہ مسلمانوں میں اس خیال کو عام کرا دیا جائے کہ اسلام کے متعلق جو (علم و بصیرت اور عقل و شعور کی) نئی نئی باتیں وضع کی جا رہی ہیں۔ یہ سب بدعت، الحاد اور بے دینی کی طرف لے جانے والی ہیں۔ حقیقی اسلام وہی ہے جو اسلاف سے مسلسل چلا آ رہا ہے۔ اس سے پہلے، اقوام مغرب، مسلمان مذہب پرستوں کو قدامت پرست ——— (CONSERVATISTS)۔ جامد اور متصلب (ORTHODOX)۔ جہالت پسند (OBSCURANTISTS) اور ان کے اسلام کو ملائزم، کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ ان

فنڈامینٹل ازم خطابات میں نفرت اور حقارت پائی جاتی تھی اس لئے انہوں نے اپنی اس جدید تحریک کے لئے نام بھی جدید تجویز کیا یعنی (FUNDAMENTALISM) اور اس کے داعیوں کو (FUNDAMENTALISTS) کہہ کر پکارنے لگے۔ اس کے لئے ابھی اردو زبان میں کوئی خاص اصطلاح تجویز نہیں ہوئی۔ اسے عام طور پر "بنیادی اسلام" کہہ کر متعارف کرایا جاتا ہے۔ اس تحریک کا مقصد ہے:۔

(۱) مسلمانوں کو قرآن اور علم و بصیرت، فکر و تدبر، عقل و شعور سے دُور رکھنا اور

(۲) ہمارے عہد ملوکیت میں وضع شدہ اسلام کو 'بنیادی اسلام' کی حیثیت سے عام کرنا اور عوام کے جذبات کی تسکین کے لئے اسے اسلاف کی طرف منسوب کرنا۔

دیکھتے ہی دیکھتے یہ تحریک قریب قریب تمام مسلم ممالک میں پھیل گئی۔ یہ جو آپ اس وقت ساری دنیا میں مسلم انسٹی ٹیوٹ اسلامک سنٹرز، اسلامک مشن، اسلامک کانفرنسز اسلامک سیمینارز، اسلامک لیکچرز، اسلامک لٹریچر کی بھرمار دیکھ رہے ہیں، یہ سب اسی شجرۂ الزقوم کی شاخیں ہیں۔ روزنامہ ڈان کی ۲۵ مارچ ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں شائع شدہ ایک مضمون کی رُو سے، صرف امریکہ اور کینیڈا میں (۲۷) اسلامک سینٹرز تھے (یہ ۱۹۸۱ء کی بات ہے۔ اس وقت تک معلوم یہ اکاس بیل کس کثرت سے پھیل چکی ہوگی)۔ مغربی ممالک اپنی (خلاف اسلام) اسکیموں کے فروغ اور وسعت کے لئے جسطرح بے دریغ روپیہ صرف کرتے ہیں، اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، آپ نے بھی اس پر بھی غور فرمایا ہے کہ ہمارے مولوی صاحبان (جن کی معروف آمدنی کی محدودیت کا سب کو علم ہے) کسطرح ہوائی جہازوں پر اڑتے اور ساری دنیا کے چکر کاٹتے پھرتے ہیں اور یورپ اور امریکہ کے بہترین (FIVE-STAR) ہوٹلوں میں قیام فرماتے ہیں۔ کسی نے کبھی اس کی بھی تحقیق کی ہے کہ اس قدر بے حد و حساب روپیہ کہاں سے آتا ہے؟ اور کس مقصد کے لئے صرف ہو رہا ہے؟ اقوام مغرب کو احیائے قرآن کے جذبہ سے جو خطرہ لاحق ہو رہا تھا، انہوں نے اپنی بے پناہ دولت کے بل بوتے پر، اسے غیر مؤثر بنا کر امت کو کس طرح ہزار برس پیچھے دھکیل دیا ہے۔ اور اس کے بعد مطمئن بیٹھے ہیں کہ جو کام توپ و تفنگ

سے نہیں ہو سکتا تھا وہ ڈالر اور سٹرلنگ کے زور سے بامن ہو رہا ہے۔

بت صنم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے ہے خوشی ان کو کہ کعبے کے نگہبان گئے
منزل دہر سے اونٹوں کے حدی خواں گئے اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے

چونکہ اس تحریک میں علم و بصیرت کو کفر اور عقل و شعور کو الحاد قرار دیا جاتا ہے، اس لئے مذہب کو جذبات کے زور پر پھیلا دیا جاتا ہے۔ اس سے ان ملکوں میں مذہبی جنون (FANATICISM) عام ہو رہا ہے جن میں فنڈامینٹل ازم کا دور دورہ ہے۔ یہ جنون منظم ہو کر "اسلامی دہشت گردی" کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اسلام آباد سے شائع ہونے والے روزنامہ "دی مسلم" کی ۱۴ ستمبر ۱۹۸۴ء کی اشاعت میں ایک مبسوط مقالہ شائع ہوا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ملائشیا میں کسلرع اس تحریک نے بغاوت کی شکل اختیار کر رکھی ہے اور اس سے وابستہ مذہب پرست، اسلام پسند جماعت (P.A.S) حکومت کے مدمقابل کھڑی ہو رہی ہے اور اعلان کر رہی ہے کہ "ہم اپنے اسلامی جہاد کو آخر تک جاری رکھیں گے"۔ اسی قسم کی آگ دیگر مسلم ممالک میں بھی سلگ رہی ہے اور اس طرح مسلمان خود مسلمانوں کی تلوار سے ذبح ہو رہے ہیں۔ دو برس ادھر کی بات ہے، ڈیوک یونیورسٹی کے ایک پروفیسر (DR. BRUCE B. LAURENCE) جو وہاں ریلیجن کے استاد اور عربی اور اسلامی مطالعاتی پروگرام کے مشیر ہیں، پاکستان آئے تھے۔ ان کا ایک انٹرویو، کراچی کے روزنامہ ڈان کی (۱۱) جون ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اس سوال کے جواب میں کہ ان کے نزدیک فنڈامینٹل ازم کا مفہوم کیا ہے، انہوں نے کہا تھا

اس تحریک کے سامنے وابستگان کی ایک مشترکہ خصوصیت یہ ہے کہ یہ غیر مسلموں ہی کی نہیں، خود اپنے مسلمان بھائیوں کی بھی کسی بات کو برداشت نہیں کرتے۔
انہوں نے کہا کہ فنڈامنٹلسٹ وہ ہے جو اس بات پر مصر ہوتا ہے کہ صرف اس کا نقطہ نظر اور مسلک صحیح ہے، باقی سب گمراہ ہیں۔ وہ مصر کے اخوان المسلمون ہوں یا ایران کے مجاہدین، ان سب کا طرز عمل متعصبانہ (بے لچک) ہوتا ہے اور کسی دوسرے کی بات ماننے کی ان کے ہاں گنجائش نہیں ہوتی۔

(بحوالہ طلوعِ اسلام۔ اگست ۱۹۸۲ء صفحہ ۸۷)

ان کی یہی ذہنیت انہیں دوسرے مسلمانوں کے خلاف نفرت اور عداوت، معاشرہ میں دہشت گردی اور خود حکومت کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر دیتی ہے۔ وہ اسے جہاد سمجھتے ہیں اور اس میں جان دے دینے کو شہادت۔ اوائل دسمبر ۱۹۸۲ء کی بات ہے، صدر مملکت پاکستان نے امریکہ کے جریدہ ٹائمز کے نئی دہلی میں متعین نمائندہ کو انٹرویو دیا تھا جو اس جریدہ کی (۱۳) دسمبر کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اس میں ان سے پاکستان میں فنڈامینٹل ازم سے متعلق بھی

سوال کیا گیا تھا جس کے جواب میں انہوں نے فرمایا تھا۔

پاکستان میں فنڈامینٹل ازم

مختلف ماحول میں احیائے اسلام کا مفہوم مختلف ہوتا ہے۔ اسلامی فنڈامینٹل ازم کا جو مفہوم بعض اوقات مغرب میں لیا جاتا ہے، اسے براہِ کرم مذہبی جنون، ضد اور تعصب اور جمہود و تصلب سے مخلوط نہ کیجئے۔ پاکستان میں ہمیں اس کا احساس ہے کہ اسلام میں ایسی لچک ہونی چاہیئے جس سے وہ عصرِ حاضر کے تقاضوں اور زندگی کے مطالبات کو پورا کر سکے۔ یہ اسلامی تحریک تھی جس سے یہ ملک وجود میں آیا تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو ہم بھی ہندوستان کا ایک حصہ ہوتے۔ ہم اس نظریہ حیات کے احیاء کے لئے کوشاں ہیں جو تخلیق پاکستان کا موجب تھا لہٰذا پاکستان میں آپ جیسا کریسی نہیں پائیں گے۔ ہم معاشرہ کی اخلاقی اقدار کا احیاء انقلاب کے ذریعے نہیں ارتقا کی رُو سے کرنا چاہتے ہیں۔

(بحوالہ طلوعِ اسلام۔ جنوری ۱۹۸۳ء صفحہ ۱۵)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ

(۱) فنڈامینٹل ازم نہ اسلامی ہوتی ہے نہ غیر اسلامی۔ وہ ایک متعین تنظیم و تحریک ہے جس کا اپنا مفہوم اور اپنا مقصد ہے۔ وہ اس میں نہ کسی لچک کے قائل ہوتے ہیں، نہ کسی سے مفاہمت کے لئے تیار۔ اگر کوئی ان سے متفق ہو جائے تو خیر، ورنہ وہ تصادم پر اتر آتے ہیں۔ جنون اور تعصب، تشدد اور تعصب اس کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ مختلف ممالک میں اس کی (STRATEGY) تو مختلف ہو سکتی ہے، مقصد و مفہوم الگ الگ نہیں ہو سکتے۔ وہ تو ایک عالمگیر مذہب کی حیثیت اختیار کئے ہوئے ہے۔

(۲) ہم نے اس اسلام کی رُو سے یہ خطۂ زمین حاصل کیا تھا جس کی تشریح علامہ اقبالؒ نے کی تھی اور جو قرآن اور علم و بصیرت کی بنیادوں پر استوار تھا۔

(۳) پاکستان میں وہ تھیاکریسی عملاً رائج ہے جسے ختم کرنے کے لئے پاکستان کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔

(۴) اب یہاں فنڈامینٹل ازم بھی اپنے پاؤں پھیلا رہی ہے۔ واضح رہے کہ فنڈامینٹلسٹ اس تحریک کو اس نام سے نہیں پھیلاتے۔ ہر ملک میں اس کا نام الگ الگ رکھا جاتا ہے۔ امریکہ سے شائع ہونے والے لٹریچر میں ان کی سرگذشتیں ملتی ہیں۔ پاکستان میں اسکے آثار ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تحریک میں پائے جاتے ہیں۔ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے، انہوں نے ایک دفعہ خود اپنے متعلق کہا تھا کہ وہ فنڈامینٹل اسٹ ہیں۔ ان کی تحریک کے

عناصر ترکیبی یہ ہیں
(۱) قرآن کا نام بکثرت دھرایا جائے لیکن اسے دین میں آخری سند نہ تسلیم کیا جائے۔
(۲) دین میں سنت اور حجیت اسلاف کا مسلک قرار دیا جائے اور اس سے اعراض یا اختلاف کو الحاد اور ارتداد کا موجب گردانا جائے۔ یوں تو ڈاکٹر اسرار صاحب اپنے مسلک کو جستہ جستہ اکثر بیان کرتے رہتے ہیں لیکن انہوں نے اسے جامع طور پر اپنے ماہنامہ میثاق کی اشاعت بابت ستمبر ۱۹۸۴ء میں واضح کیا ہے۔ ذیل کے اقتباسات وہیں سے لئے گئے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، فنڈا مینٹل ازم کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے ذہن میں اس عقیدہ کو راسخ کر دیا جائے کہ بنیادی اور حقیقی اسلام وہ ہے جو ان کے ہاں اسلاف سے متواتر چلا آرہا ہے۔ اس عقیدہ کی راہ میں، قرآن اور علم و بصیرت دشوار گذار رکاوٹیں ہیں۔ جب تک انہیں راستے سے ہٹایا نہ جائے اسلاف پرستی دین نہیں بن سکتی۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب یہی ٹیکنیک اختیار کر رہے ہیں۔ پہلے تو انہوں نے اپنی تحریک کو قرآن سے منسوب کیا۔ انجمن خدام القرآن۔ قرآن اکاڈمی۔ قرآن کانفرنس۔ حکمت قرآن وغیرہ تاکہ کسی کے دل میں یہ شبہ نہ گذرے کہ وہ حجیت الی القرآن کے خلاف ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنے حقیقی مقصد کی طرف آئے، فرمایا۔

> ماضی بعید و قریب میں مسلمانوں میں جتنی بھی گمراہ کن تحریکیں اٹھیں وہ سب قرآن کا نام لے کر اٹھیں۔ (میثاق ستمبر ۱۹۸۴ء۔ صـ۲۹)

یعنی بیک جنبش قلم یہ خیال عام کر دیا کہ قرآن کے نام سے جتنی تحریکیں بھی اٹھی ہیں وہ سب گمراہ کن تھیں۔

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ہمارے زمانے میں جس ہستی نے امت کی توجہ قرآن اور علوم حاضرہ کی طرف مبذول کرائی تھی وہ سرسیّد تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی مہم کا آغاز انہی کو مطعون کرنے سے کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

> ان سب سے پہلے بہت سی گمراہیوں کا سرسیّد احمد خاں نے آغاز کیا قرآن کے نام پر (صـ۲۹) دو صفحے آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

> ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی تمام نہاد حکومت بالکل ختم ہو گئی اور برصغیر پاک و ہند پر سیاسی اعتبار سے حکومت برطانیہ کا تسلط و استیلا کامل طور پر ہو گیا تو غلامی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ۱۹۴۷ء تک یہ نوّے سال کا دور ہے۔ اس دور میں قرآن کے حوالے سے جو سب سے پہلی زوردار آواز اٹھی ہے وہ سرسیّد احمد خاں کی ہے۔ پندرہ پاروں کی انہوں نے تفسیر بھی لکھی۔ انہوں نے ایسے ایسے نکتے اٹھائے

کہ حدولبس ہے۔ (ص۳۱)

لیکن انہوں نے سرسیّد کو یہ کہہ کر قابلِ معافی قرار دے دیا کہ،

ان گمراہ کن تاویلات کے باوجود ایک اچھی بات سرسیّد کے حق میں جاتی ہے اور وہ یہ کہ اگرچہ انہوں نے اپنی تفسیر میں یہ باتیں کہیں لیکن نہ تو انہوں نے کوئی اپنی جماعت بنائی۔ نہ کسی دینی فرقہ کا انہوں نے آغاز کیا۔ وہ اصل میں مشہور و معروف ہوئے ایک سماجی مصلح اور مسلمانوں کے ایک قومی لیڈر کی حیثیت سے چونکہ ان کا دینی معاملہ صرف نظریات کی حد تک رہا۔ انہوں نے اس کی بنیاد پر کوئی تنظیم قائم نہیں کی۔ کوئی جماعت نہیں بنائی۔ لہٰذا اس نے ایک فتنہ کی شکل اختیار نہیں کی[1]۔ (ص۳۲)

اس کے بعد انہوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کا ذکر کیا ہے تاکہ ان کی تحریک کو بھی قرآن کے نام پر اٹھائی جانے والی تحریکوں میں شامل کر کے عوام کے جذبات کو مشتعل کر دیا جائے۔ اس قسم کا پراپیگنڈہ بڑا مؤثر ہوتا ہے۔ اس جملہ معترضہ کے بعد وہ اپنے اصلی ہدف کی طرف آتے ہیں اور فرماتے ہیں:۔

جرائم کی فہرست

پھر ہمارے دور میں غلام احمد پرویز صاحب نے جو گمراہی پھیلائی اور جو مسلسل پھیل رہی ہے وہ تو بالکل سامنے کی بات ہے (ص۳۳)۔ اس نے لونڈی غلاموں کا مسئلہ اٹھا دیا۔ یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ تعددِ ازدواج کا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ یہ وہ مسائل ہیں جو قرونِ اولیٰ سے تا امروز متفق علیہ رہے ہیں۔ اہلِ سنت کے تمام فقہی مکاتب کا ان پر اجماع ہے۔ یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ بڑا حساس (TOUCHY) ہے۔ اس نے بڑے (PATHETIC) انداز میں اس مسئلہ میں رقت آمیزی (PATHOS) پیدا کی اور اپنے زورِ قلم سے یتیم پوتے کے لئے ہمدردیاں حاصل کیں۔ (ص۳۳)

آپ نے پرویز کا جرم ملاحظہ فرما لیا؟ اس نے رقت آمیز انداز سے اپنے زورِ قلم کے ذریعے یتیموں کے حق میں ہمدردیاں حاصل کیں! معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب خود خدا کے متعلق کیا ارشاد فرمائیں گے جس نے اپنی کتاب میں جا بجا نہایت "رقت آمیز اور پُر زور" انداز سے یتیموں کے حقوق کی یاد دلائی ہے۔ ۱۹۶۹ء کی بات ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی مرکزی انجمنِ خدام القرآن کے مکتبہ

[1] معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب اپنے متعلق کیا کہیں گے جنہوں نے چھوٹتے ہی ایک جماعت بھی بنائی اور ایک تنظیم بھی قائم کی ہے

کی طرف سے ایک کتاب شائع ہوئی جس کا دیباچہ ڈاکٹر صاحب نے تحریر فرمایا تھا۔ اس میں لکھا گیا تھا۔ کہ یتیم پوتے کو اس کے دادا کے ترکہ میں سے حصہ نہیں مل سکتا۔ طلوعِ اسلام میں اس موضوع پر اس سے بہت پہلے سے لکھا جا رہا تھا کہ قرآن کریم کی رُو سے یتیم پوتا اپنے دادا کے ترکہ سے محروم نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے مؤقف کے حق میں قرآن سے کوئی دلیل دینے کے بجائے لکھا تھا کہ۔

اس کے بارے میں تمام امتِ مسلمہ گزشتہ چودہ صدیوں سے متفق الرائے ہے کہ مورث کے بیٹے کی موجودگی میں اس کا پوتا یا نواسہ وراثت میں حقدار نہیں۔

(طلوعِ اسلام فروری ۱۹۷۹ء۔ صـ۶۲)

وہی قرآن کے مقابلہ میں اسلاف پرستی!

غلام اور لونڈیاں

ڈاکٹر صاحب نے دوسرا الزام "غلام اور لونڈیوں" کا لگایا ہے۔ انسانوں کو غلام (اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں) بنانا، انسانیت کے خلاف ایسا شنیع اور عظیم جرم ہے جس کا تصور بھی قرآن نہیں کر سکتا۔ آپ قرآن کریم کو شروع سے آخر تک دیکھ جائیے کسی ایک جگہ بھی غلام بنانے کا حکم تو ایک طرف، اس کی اجازت بھی نہیں ملتی۔ اس کے برعکس غلاموں کو آزاد کرانے کی بار بار تاکید ملتی ہے۔ سورۂ بلد میں دین کو العقبۃ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنے سے اس کے بعد کہا ہے وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ۔ خدا کے سوا تمہیں کون بتائے گا کہ العقبہ کیا ہے۔ اس کے جواب میں کہا فَكُّ رَقَبَةٍ (۹۰/۱۳)۔ غلاموں کو آزاد کرنا۔ یعنی قرآن کے نزدیک، غلاموں کو آزاد کرنا اور آزاد کرانا، دین کی اصل و اساس ہے۔ سورۃ بقرہ میں ہے کہ "یہ تو تقویٰ یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف..... اصل یہ تو تقویٰ یہ ہے کہ تم مال کی محبت کے باوجود اسے دوسرے ضرورت مندوں کی احتیاج رفع کرنے کے لئے صرف کرو۔ اور ان میں "فِی الرِّقَابِ" (۲/۱۷۷) خاص طور پر کہا گیا ہے۔ یعنی غلاموں کو آزاد کرانے کے لئے۔ سورہ توبہ میں صدقات کے مصارف میں "فی الرقاب" کو شامل کیا گیا ہے (۹/۶۰)۔ متعدد مقامات پر بعض لغزشوں کے کفارہ کے طور پر "تحریر رقبۃ" غلام آزاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ (مثلاً ۴/۹۲ - ۵/۸۹) اس سے وہ غلام اور لونڈیاں مراد ہیں جو نزولِ قرآن کے زمانے میں عربی معاشرہ میں موجود تھے اور جنہیں قرآن نے ما ملکت ایمانکم کہہ کر پکارا ہے۔

یہ ہے غلامی کے متعلق قرآن کریم کا مسلک و مؤقف۔ اس کے برعکس ڈاکٹر صاحب کا اس باب میں عقیدہ کیا ہے؟ اسے انہوں نے اپنی ایک تقریر میں واضح کیا تھا جو روزنامہ جنگ (لاہور) کی (۱۲) فروری ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں انہوں نے فرمایا تھا۔

مالِ غنیمت میں ہاتھ آ جانے والی لونڈیوں کے بارے میں کئے جانے والے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ حضورؐ کے زمانے میں غلاموں اور لونڈیوں کا معاملہ تھا۔ قرآن میں اس کے خاتمے کی کوئی آیت نہیں۔ لیکن اسلام کے نزدیک غلام بنانا شرک ہے لیکن لونڈیوں کے معاملہ میں تمتع کی اجازت ہے۔ نکاح ضروری نہیں۔ لیکن اگر انہیں آزاد کر کے نکاح کر لیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ لونڈیوں سے پیدا ہونے والی اولاد کے وہی حقوق ہوں گے جو دوسری بیویوں کے ہونے والی اولاد کو حاصل ہوں گے۔

طلوعِ اسلام کی جو شامت آئی تو اس نے اس پر حسبِ ذیل تنقید کر دی (جس کا خمیازہ وہ آج تک بھگت رہا ہے) اس نے لکھا:۔

(۱) ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے کہ قرآن میں غلاموں اور لونڈیوں کے خاتمے کی کوئی آیت نہیں۔ اگر انہیں قرآن میں ایسی آیت نظر نہیں آئی تو ان کی نظر کا قصور ہے نہ کہ قرآن کا۔ اقبالؒ نے سچ کہا تھا۔ دیدہ بینہ ہے تیرا مرض کور نگاہی!

(۲) "قرآن نے اسے ختم نہیں کیا لیکن اس کے باوجود غلام بنانا شرک ہے"! (کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی)

(۳) غلام بنانا شرک ہے لیکن لونڈیاں بنانا اور ان سے بغیر نکاح جنسی اختلاط عین مطابق اسلام ہے۔ (صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے)

جس قوم کے مجتہد ایسے ہوں ان کا خدا حافظ (طلوعِ اسلام مئی ۱۹۸۳ء۔ صفحہ)

ہم سے دراصل یہ غلطی اس سے بہت پہلے سرزد ہو چکی تھی۔ سنہ ۱۹۷۳ء کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایچی سن کالج (لاہور) میں (سورۃ العصر کی تفسیر کے طور پر) ایک تقریر فرمائی جسے کالج کی طرف سے راہ نجات کے عنوان سے، ایک پمفلٹ کی شکل میں شائع کیا گیا۔ وہ پمفلٹ طلوعِ اسلام کو تبصرہ کے لئے موصول ہوا تو دیکھا گیا کہ اس میں قرآنی نقطۂ نگاہ سے کئی ایک اسقام ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے آپ کو قرآن کا طالب علم کہتے تھے۔ (وہ اب بھی یہی کہتے ہیں۔ انہوں نے میثاق بابت ستمبر سنہ ۱۹۸۴ء میں لکھا ہے کہ "میں عالم دین ہونے کا ہرگز مدعی نہیں ہوں۔ میں قرآن کریم کا ایک ادنیٰ طالب علم اور ادنیٰ خادم ہوں")۔ ہم نے ان مقامات کی نشاندہی کی جو قرآن کریم کی رُو سے صحیح نہیں تھے۔ اور اس کے ساتھ ہی مشورۃً ایک گزارش بھی ان کے پیشِ خدمت کی۔ ہم نے لکھا تھا:۔

ڈاکٹر صاحب کے حسنِ نیت، خلوصِ مقصد اور قرآنی تعلیم کی تبلیغ کے لئے ان کے جذبۂ ایثار کی بناء پر ہمارے دل میں ان کا بڑا احترام ہے۔ اسی احترام کی بناء پر ہم ان کی خدمت میں یہ مشورہ پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ اگر وہ چاہتے ہیں کہ انکی تبلیغ صحیح نتائج پیدا کرے، تو وہ پہلے کچھ مزید عرصہ کے لئے "طالب العلمانہ" روش اختیار کریں۔ پہلے اپنے ذہن کو سابقہ تصورات و تاثرات سے پاک اور صاف

کریں اور پھر قرآنی حقائق کا اور زیادہ غور و تدبر سے مطالعہ کریں، اور تبلیغی میدان میں اس وقت اتریں جب ان کی فکر میں پختگی پیدا ہو جائے۔ وہ (بالعموم) تعلیمیافتہ طبقہ میں اپنے درس دیتے ہیں، اور ان کے سامعین بھی یہ سمجھ کر ان کا درس سننے آتے ہیں کہ وہ کوئی "کٹ مُلّا" نہیں، تعلیمیافتہ مبلغِ قرآن ہیں۔ اس سے ان کی ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ناپختگیٔ فکر کی بناء پر قرآنی حقائق پیش کرنے کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ جب (ازاں بعد) وہ اپنی ناپختگیٔ فکر کے زمانے کے استقام محسوس کرتا ہے تو جتنی محنت اس نے ان (غلط) نقوش کے مرتسم کرنے میں صرف کی تھی اس سے کہیں زیادہ محنت انکے مٹانے میں صرف کرنی پڑتی ہے۔ اور پھر بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ مختلف ذہنوں سے وہ تمام نقوش مٹا دیئے گئے ہیں نہ معلوم وہ نقوش کہاں کہاں پہنچ چکے ہوتے ہیں اور کن کن گہرائیوں تک۔ تبلیغِ قرآن کا راستہ "پل صراط" ہے۔ بال سے بھی زیادہ باریک اور تلوار سے بھی زیادہ تیز، اور نیچے شعلہ فشاں جہنم! (طلوعِ اسلام اکتوبر ۱۹۷۳ء صفحہ ۴۷)

ہمیں اعتراف ہے کہ ہمیں ڈاکٹر صاحب کی نفسیات کے سمجھنے میں مغالطہ ہو گیا تھا۔ انہوں نے اپنی جماعت میں داخل ہونے والوں سے باقاعدہ بیعت لینی شروع کر دی ہے۔ ان کے معتقدین انہیں "مرشد" کہتے ہیں اور "امیر" بھی۔ عام طور پر وہ ممتاز عالم دین کہہ کر پکارے جاتے ہیں۔ جب انسان اس مقام پر پہنچ جائے تو اگر اس کی کسی غلطی کی نشاندہی کی جائے تو وہ اسے اپنی توہین سمجھتا ہے اور اس کا انتقام لینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

مولانا اصلاحی

ہم تو خیر ایک جماعت کے امیر اور مرشد کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ ڈاکٹر صاحب اب اپنے آپ کو اس مقام بلند پر فائز سمجھتے ہیں جہاں کوئی ان کا ہمسر نہیں ہو سکتا۔ آپ نے ایک (پرانا) محاورہ سنا ہو گا۔ بازی بازی باریش بابا ہم بازی۔ وہ اس حد تک آگے بڑھنے میں بھی کوئی باک نہیں سمجھتے۔ مولانا امین احسن اصلاحی سے ہمارے اختلافات ہیں لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ علمی دنیا میں ان کا اپنا مقام ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا مذہبی اور علمی دنیا میں تعارف انہی کی نسبت سے ہوا تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب اب انہیں بھی نہیں بخشتے۔ فرماتے ہیں۔

میرے لئے اس معاملہ میں بہت بڑی کنفیوژن والی بات ہو گئی تھی۔ وہ یہ کہ ایک بزرگ جن سے میرا بھی طویل عرصہ تک قریبی تعلق و رابطہ رہا ہے۔ میں نے ان کی

خدمت بھی کی ہے اور ان کے فکر کی بھی^1 ہیں نے ان کی کتابوں کو ستائے بھی کیا ہے
میرا اشارہ مولانا صاحب رجم کے مسئلہ میں آکر ان بزرگ نے بھی وہی روش اختیار کی
ساری عمر قرآن پڑھنے پڑھانے میں بتا کر آخر کار یہ ہوا کہ رجم کے متعلق یہ رائے دیدی کہ
شادی شدہ اور غیر شادی شدہ زانی کے لئے اسلام میں حد علیحدہ علیحدہ
نہیں ہے بلکہ شادی شدہ زانی کے لئے بھی وہی سو کوڑے ہیں جو قرآن
میں آئے ہیں۔ (ص۳۹)

یعنی ان کا جرم یہ ہے کہ ان کے نزدیک شادی شدہ زانی کی بھی وہی سزا ہے جو
قرآن میں آئی ہے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:۔

اللہ تعالیٰ ان بزرگ کو معاف کرے۔ ابھی وہ زندہ ہیں اور انہیں توفیق دے
کہ وہ رجوع کریں اور توبہ کریں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس کی ہمت دے (ص۳۹)
اس سے بھی آگے بڑھ کر، ان کی آخرت کے متعلق فیصلہ دینے سے بھی نہیں
چوکتے۔ فرماتے ہیں۔

حسرت ہوتی ہے تو اس بات پر کہ عمر کے آخری حصہ
میں کوئی شخص ایسی کمائی لیکر اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچے (ص۴۵)

مولانا صاحب کا ایک جرم یہ بھی ہے کہ وہ زندہ ہیں۔ اگر (خدا ان کی عمر دراز کرے)
وہ وفات پا چکے ہوتے تو ان کا شمار اسلاف کے زمرہ میں ہوتا اور اسطرح
ڈاکٹر صاحب کے نزدیک واجب الاحترام ہو جاتے۔
پھر ڈاکٹر صاحب عمائدانہ ان کی سیرت و کردار پر بھی چھینٹا دے گئے ہیں فرمایا:۔

غور کیجئے کہ آج کل کے ہم لوگ جس نوعیت کے ہیں۔ ہماری سیرت و کردار کے
جو معیارات ہیں ان کے اعتبار سے کوئی مجتہد مطلق بن کر کھڑا ہو جائے اور
خلفائے اربعہ۔ ائمہ اربعہ۔ تمام محدثین کی متفق علیہ اور مجمع علیہ رائے کیخلاف
رجم کے معاملہ میں کہہ دے کہ یہ حد نہیں، تو دینی اعتبار سے یہ کتنی خطرناک
بات ہے۔ یہ تو تمام اسلاف کے فہم دین کے خلاف عدم اعتماد ہے۔ ایسے متفق علیہ
مسئلہ کے خلاف اپنا اجتہاد پیش کرنا۔ یہ ہوتا ہے دراصل کسی فتنہ کے
آغاز کا سبب۔ (ص۴۴)

ہم مولانا اصلاحی کی مدافعت نہیں کرنا چاہتے وہ اپنی مدافعت آپ کرنے کے قابل

ص۱ ان سے جو استفادہ کیا ہے اس کا کوئی ذکر نہیں۔ احساسِ برتری میں مبتلا انسان کسی کے احسان کے
اعتراف کو اپنے لئے باعثِ تحقیر خیال کیا کرتا ہے۔

(اور کہیں بہتر طور پر قابل) ہیں۔ ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب، اپنے ایک بزرگ کو اتنا بڑا (معاف بفرمائیے) خطا کار اور گنہگار ٹھہرانے کے لئے، قرآن کی کوئی سند یا دلیل پیش نہیں کرتے سند صرف یہ پیش کرتے ہیں کہ یہ اسلاف کے متفق علیہ فیصلہ کے خلاف ہے۔

اور یہی وہ مقام ہے جہاں فنڈامینٹلزم اس امت کو پہنچانا چاہتی ہے۔ قرآن نہیں۔ اسلاف کا مسلک! ڈاکٹر صاحب نے مولانا اصلاحی کی تفسیر کی چوتھی جلد شائع کی تھی جس میں (بقول ان کے) رجم کا مسئلہ بیان ہوا تھا۔ اس وقت تو اسے شائع کر دیا۔ اب فرماتے ہیں:۔

> جیسے ہی طباعت کے بعد ان کی تفسیر کی چوتھی جلد میں رجم کی بحث میرے علم میں آئی اسی وقت الحمدللہ میں نے طے کر لیا تھا کہ میں اس جلد کو دوبارہ شائع نہیں کروں گا۔[1]

کیوں؟

> اس لئے کہ میرا تعلق اسلاف کے ساتھ ہے اور اسلاف سے خود کو کاٹ دینا ہلاکت کے مترادف ہے۔.... یہ میری پختہ رائے ہے اور میں اس پر جازم ہوں کہ کسی مسئلہ پر اسلاف کی متفقہ رائے سے اختلاف، خواہ وہ کسی ایک مسئلہ میں ہی کیوں نہ ہو، انتہائی خطرناک ہے۔ اسی طرح فتنوں کا آغاز ہوتا ہے۔ (صـ۴۴)

اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (۲/۱۷۰)۔ "خواہ وہ بات عقل کے بھی خلاف ہو اور قرآن کے بھی خلاف۔ آپ پھر بھی اسی پہ جمے رہیں گے"۔ اسلاف کہیں گے کہ

> بنی اسرائیل کا جو گروہ کھو گیا تھا، چوہے وہی ہیں۔ (بخاری)

تو آپ اس پر آمنا وصدقنا کہیں گے اور جو کہے گا کہ یہ حضور نبی اکرمؐ کا ارشاد نہیں ہو سکتا اسے منکرِ حدیث اور اسلاف کی تحقیر کا مجرم قرار دے کر حوالۂ دار و رسن کر دیا جائے گا۔ اس باب میں ڈاکٹر صاحب کے جذبات (یا عقائد) کی شدت کا یہ عالم ہے کہ وہ فرماتے ہیں:۔

> جو شخص بھی دین کی کسی خدمت کا مدعی ہو۔ اس کو پرکھنے، اس کے خلوص کو جانچنے کا ایک معیار اور اصول یہ بھی بنا لیجئے کہ اس کی صحبت میں بیٹھنے سے، اس

---

[1] اسے پہلی بار شائع کرنے سے (بقول آپ کے) جس گمراہی پھیلانے کے آپ مرتکب ہوئے تھے، اس کا ذمہ دار کون ہے؟

کی باتیں سننے سے، اس کی کتابیں پڑھنے سے، آیا اسلاف کے ساتھ دل میں احترام، محبت اور حسن ظن پیدا ہوتا ہے یا اس کے برعکس سوء ظن کا معاملہ ہوتا ہے۔ یہ بھی گویا اس بات کے لئے ایک اہم پہچان ہو گی کہ جو کام بھی خدمت دین یا قرآن کے نام پر اٹھا ہے، آیا وہ صحیح رخ پر جا رہا ہے یا غلط رخ پر۔

یعنی معیار یہ نہیں کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی عظمت اور قرآن کریم کے احترام کا جذبہ بیدار ہوتا ہے یا نہیں! معیار یہ ہے کہ اس سے اسلاف کی محبت اور احترام پیدا ہوتا ہے یا نہیں یہ ان کا معیار ہے۔ اور ایک معیار اللہ تعالیٰ نے بھی مقرر فرمایا ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ کے ماورا اوروں کو بھی خدا کا ہمسر بنا لیتے ہیں اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی محبت خدا سے کرنی چاہیئے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔ لیکن ایمان والوں کی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ ان کی اللہ کے لئے محبت سب سے زیادہ شدید ہوتی ہے۔ اول الذکر کے انجام کے متعلق فرمایا: وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ (۲/۱۶۵) "کیا حالت ہو گی ان ظالموں کی جب یہ عذاب کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھیں گے"۔

فنڈامینٹل ازم کے عملی نتائج

اسلاف کے ساتھ محبت و احترام کی حیثیت نظری عقیدہ کی نہیں۔ اس کے عملی مضمرات بہت دور رس ہیں۔ اس سلسلہ میں دو باتیں ذہن میں رکھئے۔ ایک یہ کہ جنہیں علماء کہا جاتا ہے ان کا مبلغ علم صرف اتنا ہوتا ہے کہ پیشِ نظر معاملہ کے متعلق فلاں امام نے کیا فرمایا ہے۔ فلاں مفسر کا کیا قول ہے۔ فلاں محدث کا کیا ارشاد ہے۔ جس شخص کو ان حوالوں پر زیادہ عبور ہو گا وہ بہت بڑا عالم تصور کیا جائے گا۔ قرآن ان کے نصاب میں ہوتا ہی نہیں۔ اور اسلاف کے مسلک کے متعلق عقل و بصیرت سے کام لینا ان کے نزدیک حرام ہوتا ہے۔

مسلم انسٹی ٹیوٹ لنڈن

دوسری بات یہ ہے کہ فنڈا مینٹل ازم کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان ممالک میں اقتدار انہی علماء کے ہاتھ میں رہے۔ یعنی ان کے ہاں نظامِ حکومت تھیاکریٹک ہو تاکہ یہ دین کے رہیں، نہ دنیا کے۔

روزنامہ جنگ (لاہور) کے کالم نگار، محترم ارشاد احمد حقانی، حال ہی میں دیارِ فرنگ (اور ارضِ حرم) کے دورہ سے واپس آئے ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے لنڈن کی مسلم انسٹی ٹیوٹ کی ایک قرارداد کا تفصیلی جائزہ لیا ہے جسے انہوں نے (۱۰ ستمبر ۱۹۸۴ء) کی اشاعت میں تحریر فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

زیرِ نظر قرارداد میں مجوزہ اسلامی انقلاب کی قیادت اور راہنمائی علماء کو سونپی

گئی ہے۔ یہ مسلم انسٹی ٹیوٹ کی سوچ کا ایک اہم عنصر ہے۔ وہ جدید تعلیم یافتہ افراد اور طبقہ سے بہت زیادہ الرجک ہیں۔ ان کے نزدیک اس طبقہ کے افراد، خواہ کسی قدر صاحب علم اور دینی مزاج کے حامل ہوں اور خواہ تہذیب مغرب کی فلسفیانہ بنیادوں کے ناقد بھی ہوں، ایک اسلامی ریاست میں راہنمائی کے منصب پر فائز ہونے کے قابل نہیں۔ راہنمائی صرف علماء ہی فراہم کر سکتے ہیں کیونکہ وہ تہذیب مغرب کے مضر اثرات سے پوری طرح محفوظ ہیں، اور جدید تعلیمیافتہ افراد کے اندر ان کی تمام تر دینداری کے باوجود "مغرب زدگی" کے جراثیم موجود ہوتے ہیں۔

اس کے بعد حقانی صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

ان کی دانست میں کوئی بھی جدید تعلیم یافتہ شخص مسلمان عوام یا امت مسلمہ کی حقیقی قیادت کے منصب پر فائز نہیں ہو سکتا۔ یہ ایسی رائے ہے جسے (ULTRA-FUNDAMENTALIST) کہے بغیر چارہ نہیں۔ لیکن مسلم انسٹی ٹیوٹ کو اس پر اصرار ہے اور عالم اسلام کے لئے اس کے تجویز کردہ نسخہ کا یہ لازمی جزو ہے۔

اس سے آپ نے یہ بھی دیکھ لیا کہ فنڈامینٹل ازم، کوئی مقامی یا کسی خاص ملک کی تحریک نہیں، اسے عالمگیر تحریک کے طور پر چلایا جا رہا ہے۔ امریکہ سے شائع ہونے والے لٹریچر میں اس تحریک کے متعلق اکثر معلومات ملتی ہیں۔ اس کا بیج کہاں بویا گیا۔ اس کی جڑیں کہاں کہاں ہیں۔ اس کی آبیاری اور نشو ونما کیسے کی جاتی ہے۔ اس کے لئے فنڈز کا کیا انتظام ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس وقت یہ تحریک مختلف مسلم ممالک میں الگ الگ تنظیموں کی شکل میں ہے۔ (جن کے نام بھی الگ الگ ہیں)۔ اس کے سرپرستوں کے نزدیک اس کی آخری منزل کیا ہوگی' اس کے متعلق، امریکہ سے شائع ہونے والے جریدہ (TIME) کی (۳۰) مئی ۱۹۸۴ء کی اشاعت میں ایک بڑا معلومات افزا مضمون شائع ہوا تھا جس میں مشرق وسطیٰ کے ممالک کا سیاسی جائزہ لینے کے بعد لکھا تھا۔

مسلمانوں کی فنڈامینٹلسٹ تحریک، یعنی وہ طوفانی قوت جس نے ایران میں انقلاب بپا کر دیا تھا، اب اپنی قوت کی نمود، مصر۔ اردن، شام، سعودی عرب اور خلیج کی امارات میں بھی کر رہی ہے۔ مشرق وسطیٰ کے مسائل کے ماہرین یہ اندازے لگا رہے ہیں کہ اگر ان نصف درجن ممالک میں اس تحریک کے حامیوں نے متحدہ محاذ بنا لیا تو معلوم اس کا نتیجہ کیا ہو؟ (طلوع اسلام دسمبر ۱۹۸۳ء، صفحہ ۳۱)

لے اب دیگر مذاہب بالخصوص عیسائیت کے قدامت پسند طبقوں نے بھی اسے اپنانا شروع کر دیا ہے۔

نتیجہ ظاہر ہے! ہزار برس کی خواب غفلت کے بعد مسلم اقوام نے ہلکی سی کروٹ لی تھی کہ اقوام مغرب کو اس میں خدشہ محسوس ہوا۔ انہوں نے ایسا تریاک (افیون) ایجاد کر دیا جس سے یہ پہلے سے بھی زیادہ گہری نیند میں سو جائیں۔ جس قوم کی قیادت اس قسم کے "علماء" کے ہاتھ میں آ جائے اس کے انجام کے متعلق کسی منجم سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہو سکتی۔ اقبالؒ نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ

میں جانتا ہوں انجام اس کا — جس معرکہ کے ملا ہوں غازی

اقوام مغرب کی یہ تریاکی سازش بھی ان کی نگہ فراست میں تھی انہوں نے کہا تھا کہ

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر — پھر سلا دیتی ہے اسکو حکمراں کی ساحری

مسلم انسٹی ٹیوٹ (لندن) کے ڈائریکٹر ڈاکٹر کلیم صدیقی نے جب کہا کہ اس قسم کی قیادت، علماء ہی فراہم کر سکتے ہیں۔ تو حقانی صاحب نے ان سے کہا کہ

> پاکستان میں تو آپ کے تصور کے علماء نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تو وہ کہنے لگے کہ ہمیں انہیں پیدا کرنا چاہیئے۔ دینی مدارس میں پڑھنے والے ایک لاکھ یا اس کے لگ بھگ دینی طلبہ میں سے سو دو سو انقلابی علماء تیار کر لینا مشکل نہیں۔

ڈاکٹر اسرار صاحب نے اس کی بنیاد رکھ دی ہے۔ ماہنامہ میثاق بابت جولائی ۱۹۸۴ء میں قرآن اکیڈمی فیلوشپ (رفاقت) سکیم کا اعلان شائع ہوا ہے جس میں دو سالہ تدریسی نصاب کیلئے، ایم اے، ایم ایس سی۔ اور بی اے بی ایس سی، نوجوانوں سے درخواستیں طلب کی گئی ہیں۔ انہیں مطلوبہ "عالم" بنایا جائے گا۔ اول الذکر طالب علموں کو ایک ہزار روپیہ ماہانہ اور مؤخر الذکر کو آٹھ سو روپیہ ماہانہ وظیفہ دیا جائے گا۔ اس سے دو باتیں واضح ہیں۔ ایک یہ کہ ملک کے ذہین تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے اس سکیم میں کس قدر کشش پیدا کی جا رہی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اس تحریک کے فروغ کیلئے روپیہ کس طرح سیلاب کی طرح بہایا جا رہا ہے۔ جس درسگاہ کے طلباء کو ایک ایک ہزار روپیہ ماہانہ وظیفہ دیا جائے گا اس کے مجموعی اخراجات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے! پھر ڈاکٹر صاحب اپنے رفقاء سمیت، قریب نصف سال بیرونی ممالک، بالخصوص امریکہ کینیڈا کے دوروں پہ رہتے ہیں۔ ان کے اخراجات کا تو حساب شمار ہی نہیں ہو سکتا۔

بہرحال، پاکستان کے لئے سکیم وہ ہے جس کا تذکرہ مسلم انسٹی ٹیوٹ (لندن) کے ڈائریکٹر نے کیا ہے اور پاکستان میں اس کا آغاز بایں نمط ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اس کے ساتھ علماء کا تعاون بھی حاصل کیا جائے گا۔ فرماتے ہیں۔

> ہر وہ دعوت جو اقامت دین کو اپنا ہدف بنا کر کھڑی ہوئی ہو، اس کے لئے لازم ہے کہ علمائے حق کا اعتماد (CONFIDENCE) حاصل کرے۔ اس کے لئے پوری کوشش کرے، بھرپور کوشش کرے۔ میں دعوے کے ساتھ یہ بات کہہ رہا ہوں کہ کوئی شخص

اپنی جگہ کتنا ہی پھنّے خاں بنا پھرتا ہو وہ اُس وقت تک اُمت کے اندر دین کا کوئی مؤثر کام نہیں کر سکے گا جب تک وہ ان علماء کا اعتماد حاصل نہ کرے جن کے متعلق اسے یقینی ہو کہ ان میں للہیت ہے۔ خلوص و اخلاص ہے۔ تقویٰ ہے اور ان میں انانیت و نفسانیت نہیں ہے
(میثاق۔ ستمبر ۸۴ء صفحہ ۵۰)
یہ ہوگی وہ جماعت جسے ڈاکٹر صاحب دینی انقلاب کے لئے تیار کر رہے ہیں۔

یہ انقلاب کس طریق سے برپا ہوگا، اس کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے اجمالی طور پر جو کچھ کہا ہے، وہ طلوع اسلام کی اشاعت بابت ستمبر ۱۹۸۴ء میں آچکا ہے لیکن چونکہ اس کا بنیادی تعلق اس مقام سے ہے جس تک ہم زیر نظر مقالہ میں پہنچ رہے ہیں اس لئے مناسب سمجھا گیا ہے کہ اسے یہاں (دوبارہ) درج کر دیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب جو جماعت تیار کر رہے ہیں، اس کے متعلق انہوں نے کہا ہے کہ

وہ آرمی ڈسپلن والی جماعت ہوگی جو اپنے امیر کے اشارے پر کٹ مرنے کو تیار ہوگی۔　(میثاق بابت جولائی ۱۹۸۴ء، صفحہ ۳۶)

اس جماعت کا فریضہ اور طریق کار کیا ہوگا۔ اس کے متعلق، میثاق بابت جون ۱۹۸۴ء میں لکھا ہے،

کئی حضرات کی جانب سے سوالات ہوئے جن میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ پاکستان میں اسلام کے نفاذ کے سلسلے میں آپ کا طریق کار کیا ہوگا؟ جواباً ابا جان نے فرمایا کہ ایک مسلمان حکومت کے ہوتے ہوئے، جو اگرچہ صرف نام کے اعتبار سے مسلمان ہے، اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے ایک ایسی تنظیم کا قیام ضروری ہے جس کے رفقاء ایک امیر کے ہاتھ پر سمع و طاعت اور جہاد فی سبیل اللہ کی بیعت کریں۔ ان کی بھرپور تربیت کی جائے اور جب ایک ایسی جمعیت فراہم ہو جائے، کہ امیر کو ان کے بارے میں اعتماد ہو کہ وہ جان ہتھیلیوں پر رکھ کر آئے ہیں اور امیر کے اشارے پر کٹ مرنے کو تیار ہیں تو وہ اُس نظام کے کسی منکر کے خلاف ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے ہو جائیں گے۔ مثلاً جماعت کا امیر اگر فیصلہ کرے کہ ۱۴ اگست کو خواتین کی کھلے بندوں جو پریڈ ہوتی ہے اس کو نہیں ہونے دیں گے۔ تو اب اس منکر کے خلاف ایک تحریک اٹھ کھڑی ہوگی۔ اگر حکومت وقت اس پر رضامند ہو جائے کہ یہ پریڈ نہیں ہوگی تو کسی اور منکر کے خلاف یہی طریق عمل اختیار کیا جائے گا اور منکرات کو ختم کرنے کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اس طرح بجائے اس کے کہ خود اقتدار کے طالب بن کر سامنے آئیں، اُس حکومت کے ہاتھوں منکر کی "تنکیر" کرائی جائے اور معروف

کو رائج کرایا جائے گا۔ لیکن اگر حکومت وقت اس پر تیار نہ ہو تو ظاہر ہے اس منکر کے خلاف جانوں کو ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں اترنا ہوگا۔ گولیاں کھانی ہونگی ماریں سہنی ہوں گی۔ جیل کی صعوبتیں برداشت کرنی ہوں گی۔ لیکن یہ سب منحصر ہے اس بات پر کہ امیر کو یقین اور اعتماد ہو اپنے ساتھیوں کی تعداد پر بھی اور ان کی جانفروشی پر بھی...... !! یہ ہے وہ طریق کار جس کے ذریعے کسی نام نہاد اسلامی حکومت میں حقیقی اسلامی انقلاب لایا جاسکتا ہے (ص۲۷)

اسی ماہنامہ کی جولائی سنہ ۱۹۸۴ء کی اشاعت میں ان کے نائب ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے۔ جس میں انہوں نے ڈاکٹر صاحب کی تنظیم کے ارتقائی مراحل کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:۔

"تیسری منزل پر چڑھنے کے لئے، یعنی اللہ کے دین کو دنیا میں "قائم کر لے کے لئے یہ جہاد، قتال فی سبیل اللہ کی شکل (یعنی اللہ کے راستے میں جنگ) اختیار کرے گا۔ لہٰذا باطل تزلزل، اور اللہ کے دین کے قیام میں رکاوٹ بننے والے افراد سے نپٹنے کے لئے سیف بدست میدان میں آنا پڑے گا..... آگ اور خون کی وادی سے گزر کر یہ فریضہ ادا پائیگا۔

(میثاق بابت جولائی سنہ ۱۹۸۴ء، ص۵۵)

اس پر طلوع اسلام نے لکھا تھا۔

آپ تصور میں لائیے اس فساد کو جس کی آماجگاہ یہ بدنصیب ملک اس وقت بنے گا جب ڈاکٹر صاحب کی اسکیم عمل میں آئے گی۔ ڈاکٹر صاحب (بحیثیت امیر) جس عمل کو منکر قرار دیں گے اسے زبردستی روکنے کے لئے ان کی جماعت میدان میں آجائے گی۔ اگر حکومت نے گھٹنے ٹیک دیئے تو ھو المراد۔ ورنہ معاملہ عملی تصادم تک پہنچ جائے گا۔ اول تو ڈاکٹر صاحب کے "منکرات" کی فہرست محدود نہیں (وہ تو عیدالفطر کی سویوں اور کرکٹ کے کھیل تک کے بھی خلاف ہیں)۔ ایک منکر کے ازالہ کے بعد دوسرا منکر سامنے آجائے گا اور اسطرح یہاں جنگ و فساد کا لامتناہی سلسلہ جاری رہے گا۔ پھر، منکرات کے انسداد کے لئے، نہ تو ڈاکٹر صاحب کو کوئی لائسنس حاصل ہے، نہ ہی اس پر ان کی اجارہ داری ہے۔ جس کا جی چاہے اسی قسم کی جماعت تیار کر کے، حکومت کے، بلکہ خود ڈاکٹر صاحب کے بالمقابل (یہ کہتا ہوا) کھڑا ہوجائے کہ جسے ڈاکٹر صاحب منکر قرار دے رہے ہیں وہ ہمارے عقیدے کے مطابق، منکر نہیں، معروف ہے۔

پاکستان کے دشمن چاہتے ہی یہ ہیں کہ یہاں، مذہب کے نام پر، اس قسم کی صورت
مسلسل قائم رہے۔

یہ ہے فنڈامینٹل ازم کی وہ تحریک جسے احیاءِ اسلام کے پردے میں، مسلم ممالک کو تباہ کرنے کے لئے چلایا جا رہا ہے اسے اس مردِ راہ بیں کی نگہ حقیقت شناس نے کتنا عرصہ پہلے بھانپ لیا تھا جب کہا تھا کہ :-

چنیں دور آسماں کم دیدہ باشد — کہ جبریل امیں را دل خراشد
چہ خوش دیرے بنا کردند آنجا — پرستد مومن و کافر تراشد !

(از ارمغانِ حجاز)

آسمان کی آنکھ نے اس قسم کا دور کم دیکھا ہوگا کہ جس سے جبریل امیں کا کلیجہ شق ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہاں ایک نیا بت خانہ تعمیر کیا جا رہا ہے جس میں کافر بت تراشتا ہے اور مومن اس کی پرستش کرتا ہے۔

یہ بت ان اقوام کا تراشیدہ ہو یا خود مسلمان علما کا تخلیق کردہ نتیجہ ہر صورت میں ایک ہی ہوگا - یعنی

۱۔ ملک میں مسلسل انارکی، بلکہ خانہ جنگی کی کیفیت رہے گی۔
۲۔ کوئی مستحکم حکومت قائم نہیں ہو سکے گی۔
۳۔ اگر کوئی حکومت قائم ہوگی تو اس کی شکل تھیاکریسی کی ہوگی۔ اور تھیاکریسی میں ملک اور قوم کا جو حشر ہوتا ہے اس پر تاریخ کے اوراق گواہ ہیں۔
۴۔ فکری اور علمی حیثیت سے قوم ہزار سال پیچھے چلی جائے گی۔ کیونکہ جب کسی مسئلہ میں بھی اسلاف سے اختلاف جرم ہوگا تو قوم پر سوچ کے دروازے بند ہو جائیں گے اور
۵۔ سب سے بڑی حرماں نصیبی یہ ہے کہ قوم کے ہاتھ سے قرآن کا دامن چھوٹ جائیگا کیونکہ جب اسلاف کا مسلک مستند اور ابدی راہنمائی قرار پا جائے گا تو قرآن (معاذاللہ) بیکار ہو کر رہ جائے گا۔ اقوامِ مغرب یہی چاہتی ہیں۔

آخر میں اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ جو کچھ اس مقالہ میں لکھا گیا ہے اس سے کسی کی تحقیر مقصود ہے نہ تنکیر۔ مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ اپنوں اور بیگانوں کی طرف سے قرآن کے خلاف کس کس قسم کی سازشیں ہو رہی ہیں

تحریکِ پاکستان اور مولانا حسین احمد مدنیؒ

(از سید نور محمد قادری)

یوں تو تحریکِ پاکستان کے خلاف آوازیں تشکیلِ پاکستان کے ساتھ ہی اُٹھنی شروع ہو گئی تھیں لیکن اب کچھ عرصہ سے یہ زیادہ ہی بلند آہنگ ہو رہی ہیں۔ جناب ولی خاں، جناب شوکت حیات اور نیشنلسٹ علماء کے مکتبۂ فکر کے حضرات اسی دور میں پوری طرح کھل کھیلے ہیں۔ یہ صورتِ حالات دردمند اہلِ پاکستان کے لئے انتہائی کرب و اضطراب کا موجب ہے۔ یہی اضطراب ان چند سطور کی تسوید کا جذبۂ محرکہ ہے۔

نوائے وقت لاہور کے ۱۴ نومبر ۱۹۸۳ء کے شمارے میں جناب عبداللطیف سیٹھی کا ایک مضمون بہ عنوان "مولانا حسین احمد اور تقسیم ہندوستان کا خدائی فیصلہ" شائع ہوا تو جناب مولوی حامد میاں چراغ پا ہو گئے اور ایک مفصل مضمون بعنوان "تحریکِ پاکستان، مولانا حسین احمد مدنی اور جمعیت علماء ہند" لکھا اور اسے روزنامہ جنگ لاہور کے تین شماروں ۱۵ دسمبر ۱۹۸۳ء، ۱۶ دسمبر ۱۹۸۳ء اور ۱۷ دسمبر ۱۹۸۳ء میں شائع کرایا اس سلسلہ میں یہ دہقانی بھی چند امور پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہے۔

(۱) حامد میاں صاحب تحریر کرتے ہیں "یہ بات شاید ایڈیٹر معاصر (عبدالمجید نظامی کی طرف اشارہ ہے) کو معلوم نہ ہو کہ ان کے محبوب اور ممدوح مولانا عبدالماجد دریابادی حضرت مدنی ہی سے بیعت تھے"۔ (جنگ لاہور ۱۵ دسمبر)

اس سلسلہ میں حامد میاں صاحب کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ماجد میاں جناب مولوی حسین احمد صاحب سے بیعت تو ضرور ہوئے تھے لیکن بعد میں مردود الطریقت ہو گئے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ مدنی صاحب نے اِدھر محسوس کیا کہ ماجد میاں کے دماغ میں جو پاکستانی جراثیم پرورش پا رہے ہیں اُن کا علاج ان کے بس کی بات نہیں۔ ادھر ماجد میاں نے محسوس کیا کہ مدنی صاحب کا باوجود شیخ الکل، مجددِ عصر اور صوفی کامل ہونے کے ہر قدم مسلم مفاد کے خلاف اٹھ رہا ہے تو وہ مایوس ہو گئے اور خانقاہ تھانہ بھون سے منسلک ہو گئے کیونکہ اس زمانہ میں علماء دیوبند میں مولوی اشرف علی تھانوی صاحب ہی کی ذات تھی جو دو قومی نظریہ کی حامی تھی اور اپنے متعلقین و متوسلین کو بجائے نہرو اور گاندھی کے حضرت

قائداعظمؒ کی رہنمائی قبول کرنے کا مشورہ دیتی تھی۔

صرف ماجد میاں ہی نہیں بلکہ مولانا مدنی کے اور مریدین و مخلصین بھی ان کی غیر اسلامی روش دیکھ کر ان سے بدظن ہو گئے تھے اور ان سے بیعت توڑ کر دیوبندی سلسلہ ہی کی خانقاہ تھانہ بھون سے منسلک ہو گئے تھے۔ اس سلسلہ میں مولانا مدنی کا ایک خط جو انہوں نے مولانا محمد ابراہیم صاحب کو لکھا ہے، ذیل میں قارئین اور حامد میاں کی معلومات میں اضافہ کے لئے پیش کیا جا رہا ہے۔

غالباً جناب کو ذہول ہو گیا سورت کے میرے مرید حضرت تھانوی قدس سرہ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور تحریکات کی بناء پر سابقہ بیعت کا توڑنا، نادم ہونا اور توبہ کرنا ظاہر فرمایا اور حضرت مرحوم و مغفور سے بیعت کے خواستگار ہو کر مشرف بالبیعت ہوئے۔ کذا فی النور۔ اب آپ ہی فیصلہ فرمائیں کہ جب اہل سورت و اندبر کی یہ رائے ہے تو جناب محمد اکوجی صاحب کٹھوری کی مجھ سے بیعت کی درخواست کرنا اور آپ کا تقاضا کرنا اور وہ بھی غائبانہ بیعت کا۔ یہ امور کہاں تک قرینِ قیاس ہیں۔ حضرت تھانوی اگرچہ وصال فرما گئے .... حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی دامت برکاتہم موجود ہیں وہ بھی بیعت فرماتے ہیں۔ ان سے بیعت کرا دیجئے۔ غائبانہ کا جھگڑا، تحریکاتِ حاضرہ کا تجسس، جھگڑا ان جملہ امور سے بھی تحفظ ہوگا اور ایک ایسی لائق اور مکمل ہستی سے رہنمائی حاصل ہوگی جو ان اولادگیوں سے پاک و صاف ہے"۔

(مکتوبات شیخ الاسلام جلد دوم مطبوعہ دیوبند ص ۱۷۱ تا ۱۷۴)

مرکزی اسمبلی کے الیکشن میں ماجد میاں نے مسلم لیگ کو ووٹ دیا۔ ان کے علاقہ کے مسلم لیگی امیدوار مولانا جمال میاں بن مولانا عبدالباری فرنگی محلی تھے۔ جمال میاں کو شکست فاش دینے کے لئے دیوبند نے دریا دباد میں ڈیرہ جما لیا اور وہاں جو کچھ کیا وہ ماجد میاں کی زبانی سنیے۔

"دیوبند کے کچھ طلبار اپنے کو حضرت شیخ (مولانا مدنی) کا مرید و متبع کہنے والے ہفتہ عشرہ قبل سے قصبہ میں وارد ہو گئے تھے۔ ان میں سے کچھ تو ادھر اُدھر کو چلے گئے تھے، تین خاص قصبہ ہی میں مقیم تھے۔ مگر قصبہ میں کہاں، کسی مسجد کے حجرے میں، کسی مسلمان کی سرائے میں نہیں بلکہ خاص الخاص ہندو مہاجنوں کے دھرم شالہ میں۔ آئے تھے مسلمانوں میں کام کرنے، مسلمانوں کے اندر تبلیغ کرتے لیکن ہر وقت ان ہی لوگوں میں گھرے ہوئے جن کے خوف سے مسلمان کانگرس چھوڑے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ بستی کے کسی مسلمان کے ہاں یہ حضرات جاتے بھی تو اپنے انہی

میزبانوں کو ساتھ لئے ہوئے اور اس کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ کھل کر کوئی بات چیت ہی نہ ہو سکتی۔ یہ سیاسیات کی کوئی بہت ہی اونچی قسم کی حکمت عملی ہو تو ہو ورنہ ہم عامیوں کی سمجھ میں تو یہ کسی طرح نہیں آتا کہ جس جماعت (کانگرس) نے اتنی چپڑ اور بے زاری پیدا کر دی ہے۔ عین اُسی کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا جائے تو یہ صورت صلہ رحم کی ہوئی یا قطع اور قطع رحم کی۔"

("پاکستان بار اثر" مرتبہ بشیر افغانی مطبوعہ لاہور ص ۶۶-۶۷)

مزید فرماتے ہیں

"یہ جو کچھ بھی ہوا ہندو ہاتھ پیر سے، ہندو حلق و زبان سے اور اظہار حقیقت تلخ ہو یا شیریں، خوشگوار ہو یا ناگوار بہر حال بڑی حد تک ہندو سرمایہ سے" (وہی ص ۶۹)

(۳) مولانا مدنی: صرف مسلم لیگ کے سخت مخالف اور کانگرس کے دل و جان سے حامی تھے بلکہ جب انہیں معلوم ہوتا کہ فلاں علمی خانوادہ کے کسی فرد نے مسلم لیگ کے پروگرام کی حمایت کی ہے تو انہیں زبردست ذہنی اور قلبی دھچکا لگتا۔ اس کا مظہر ان کا وہ خط ہے جو انہوں نے مولانا ابوالحسن حیدری مجاذی پوری کو لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

لیگی حضرات مساجد کو اپنی جولان گاہ بنانے میں انشاء اللہ کامیاب نہ ہوں گے۔ کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اگر بالفرض الیسا ہو بھی تو پھر مسلم قوم کی بے راہروی کا علاج ہی کیا ہے آپ نے "مدینہ" ۵ صفر کے مضمون جس کی سرخی ہے مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ایک عینی گواہ کے قلم سے" دیکھا ہوگا۔ اب آپ ہی فرمائیے کہ جس صوبہ میں (سندھ مراد ہے) ۷۵ فیصدی سے زیادہ مسلمان بستے ہوں اور وہ لوگ بہ نسبت دوسرے صوبوں کے بہت زیادہ مذہبی شمار ہوتے ہوں، جب کہ وہاں کے مسلمانوں کی یہ انقلابی مذہبی حالت ہوگئی تو کیا امید کی جا سکتی ہے۔ اس الحاد اور بے دینی کی کوئی حد بھی ہے۔ جمعیت العلماء (ہند) اس طوفان اور شورش میں کیا کر سکتی ہے اور خود علماء کس حال میں ہوگئے ہیں۔ کیا آپ کی نظر سے یہ نہیں گذرا کہ اسی پنڈال میں لیگ کے اجلاس کے بعد علماء کا اجلاس ہوا اور پھر جھنڈے شریف کے پیر صاحب نے صدارت فرمائی۔ مولانا جمال صاحب صاحبزادہ مولانا عبدالباری صاحب مرحوم فرنگی محلی اور مولانا عبدالحامد صاحب بدایونی اور بہت سے حضرات ان تمام اجلاسوں میں شریک رہے، جب حالت اس درجہ بدل گئی ہے کہ مسلم عوام ارباب طریقت، ارباب شریعت سب کے سب اس سیلاب کے اندر بہتے ہوئے دین اور احکام دین سے برگشتہ ہوتے جاتے ہیں تو جمعیت کے مٹھی بھر آدمی اپنی خستہ حالی کے ساتھ کیا کر سکیں گے؟

۵۔ جو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

آپ کو معلوم ہے کہ جمعیت کے بھی اکثر سرگرم ارکان جیلوں میں بند ہیں۔ جو لوگ باہر ہیں وہ ڈیفنس کے آرڈی ننسوں سے خائف ہیں، یہ ایسا ہتھیار ہے کہ جس کی داد دینا فریق مخالف نے ہاتھ میں دے رکھا ہے۔ بہرحال حقیقت یہ ہے کہ ڈیفنس آف انڈیا نے عمومًا سب کو دبا رکھا ہے، نہ زبان ہل سکتی ہے نہ قلم حرکت کر سکتا ہے۔ اول تو علماء میں عمومًا احساس ہی نہیں اور جن کو کچھ احساس ہے وہ اپنی جگہ پر ہراساں اور مثل بید لرزاں ہیں۔"

(مکتوبات شیخ الاسلام جلد اول ۲۳۷ - ۲۳۸)

اس خط کے مطالعہ سے چند باتیں سامنے آتی ہیں۔

۱۔ برصغیر کے بیشتر علمی اور صوفی خانوادوں کے افراد مسلم لیگ کی حمایت کر رہے تھے اور مولانا مدنی کے نزدیک ان کا یہ فعل الحاد اور بے دینی سے کم نہیں تھا۔

۲۔ جمعیت العلماء کے ارکان کی اخلاقی جرأت کا یہ عالم تھا کہ ڈیفنس آرڈی ننسوں کے خوف سے حق بات کہنے سے کترا رہے تھے اور ہر وقت خوف سے مثل بید لرزاں و ترساں تھے۔

۳۔ اس خط میں مولانا نے شاید پہلی بار یہ اعتراف کیا ہے کہ ان کی جمعیت کے ساتھ صرف مٹھی بھر مسلمان تھے اور وہ بھی ذہنی پراگندگی اور انتشار کا شکار۔

(۳)

مولانا مدنی نہ صرف کانگرس کے حامی تھے بلکہ "فنا فی الگاندھی" ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ لکھنے کے لئے جو پیڈ اکثر استعمال کرتے اس پر بجائے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے "جے ہند" لکھا ہوتا۔ اس کی شکایت ایک خط میں جناب عبدالماجد صاحب دریابادی نے کی تو مدنی صاحب نے جو کچھ جوابًا فرمایا وہ "مکتوبات شیخ الاسلام جلد سوم کے ص۲۴ پر دیکھا جا سکتا ہے۔

مولانا مدنی کے ایک مرید باصفا جو فنا فی الشیخ کی صفت سے متصف ہو چکے تھے اور فارسی اور اردو زبان کے اچھے شاعر تھے ان کا اسم گرامی تھا مولانا اقبال احمد سہیل۔ انہوں نے حضرت علامہ کے مشہور قطعہ ؎

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ　　　　ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبیست الخ

کا جواب ایک فارسی نظم میں لکھا تھا اور یہ نظم دیوبند کے مکتبۂ فکر میں اس قدر مقبول ہے کہ بلا مبالغہ ان کی کتب و رسائل میں سینکڑوں مرتبہ دہرائی جا چکی ہے اور دہرائی جا رہی ہے۔ اس نظم کے مصنف کی تحریک پاکستان کے زمانہ میں جو دینی اور ذہنی کیفیت تھی وہ ملاحظہ ہو۔ اور اسے بھی مدنی صاحب ہی کا فیضان سمجھئے۔

"چھپرا پرگنہ چہ با کورٹ میں ایک سیاہ فام و بدشکل اور ایک نہایت حسین و جمال عورت کے دو بت تیار کئے گئے اول الذکر جہالت کا بت اور دوسرا "ماتا سرسوتی" کا

بت تھا۔ دونوں بت ایک رتھ میں رکھے گئے۔ جلوس مولانا اقبال احمد سہیل ایم۔ اے کی صدارت میں روانہ ہوا۔ مولوی عبدالحئی چیئرمین تعلیمی کمیٹی اعظم گڑھ بھی ساتھ تھے۔ حاضرین ان بتوں اور مورتیوں کے آگے ہاتھ جوڑے پرارتھنا کر رہے تھے اس کانگرسی و قومی جلوس میں بلا امتیاز مذہب و ملت تمام مدرسین و طلباء شریک ہونے پر مجبور تھے۔ آخر میں مولانا اقبال احمد ہی کی صدارت میں جلسہ شروع ہوا۔ جس کے آغاز میں "بندے ماترم" کا مشرکانہ گیت گایا گیا۔ ہندو کانگریسیوں نے تقریریں کیں جن میں تمام حاضرین کو ماتا سرسوتی دیوی کے پجاری بننے کی تلقین کی گئی۔" (رسالہ "مولوی" دہلی محرم نمبر ۱۳۵۸ھ صـ ۷۹)

مدنی صاحب جناب گاندھی کی پیروی میں اس حد تک پہنچ چکے تھے کہ جو مسلمان کھدر کا استعمال نہ کرتا اس کی نمازِ جنازہ پڑھنا بھی گناہِ عظیم خیال کرتے۔ آخر میں انہوں نے احباب کی فرمائش سے مجبور ہو کر غیر کھدر پوش مسلمانوں کے جنازہ میں شرکت کرنا تو قبول کر لیا لیکن ان کی نماز جنازہ پڑھنا ان کی غیرت نے قبول نہ کیا۔ مولانا عبدالجلیل صاحب کو ایک خط میں تحریر کرتے ہیں۔

بالکل صحیح ہے یہ میرا عمل اس وقت سے ہے جب کہ ترکِ موالات کی وجہ سے ولائتی کپڑوں کا بائیکاٹ کیا گیا۔ اس وقت سے میں نے آج تک ولیسے کپڑے پہننے اور کھدر ہی کا استعمال کیا۔ جنازہ کی نماز جب کہ اس کا کفن غیر کھدر ہوتا پڑھانا چھوڑ دیا تھا تاکہ لوگوں کو اس سے نفرت اور ولیسی مصنوعات سے الفت اور انس پیدا ہو مگر (اب) کفن اگر غیر کھدر ہوتا ہے تو میں نماز نہیں پڑھاتا ہوں پڑھ لیتا ہوں، نماز نہیں چھوڑتا۔" (مکتوبات شیخ الاسلام جلد سوم مطبوعہ دیوبند صـ ۱۹۳)

کہا جاتا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد پاکستان کے اکثر کٹر مخالفین نے جن میں ابوالکلام آزاد بھی شامل ہیں۔ پاکستان کی مخالفت ترک کر دی تھی اور اس کی ترقی اور بہبود کے دل سے خواستگار تھے۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد بھی مولانا مدنی کا جو زاویۂ نگاہ اور عقیدہ تھا وہ ذیل کے خط سے اظہر من الشمس ہے۔ مولانا عبدالرحیم صاحب کو تحریر کرتے ہیں

سنی مسلمانوں کے لئے دعا کرنا ضروری ہے۔ مگر ایک ایسی جمہوریت جب کہ اسلامی حکومت نہیں ہے کس طرح ادعیہ کی مستحق ہو سکتی ہے جن کے مستحق سنی مسلمان ہیں۔ ہاں اس لحاظ سے کہ انہوں البلیٹین (اگر اس کا ثبوت ہو جائے) تو البتہ مستحقِ ہمدردی ہو سکتی ہے۔ مگر کانگرسی صوبوں میں کفارِ اصلی برسرِ اقتدار ہیں پاکستان میں "ملاحدہ" اور "مرتدین" کا اقتدار ہے۔ دینی حیثیت سے دونوں کا فرق ظاہر ہے کانگرسی صوبوں میں انگریزی اقتدار ہر لئے نام اور اس کو رفتہ رفتہ مٹایا

جارہا ہے اور پاکستان میں اس کو ترقی دی جا رہی ہے۔ ہاں وہاں کے سنی مسلمانوں کیساتھ یقیناً ہماری پوری ہمدردی ازبس ضروری ہے ......

جناح (حضرت قائداعظم مجتہد نور محمد قادری) خود اپنے کو رافضی کہتا ہے[1]... اگر ایسے شخص کے لئے مولوی ابراہیم دعا کرانا چاہتے ہیں تو وہ اس کے ذمہ دار ہیں۔ وہ خود جانتے ہیں کہ مسٹر جناح مسلمان ہیں یا نہیں۔ آپ کا فرمانا کہ حکومت تو بہرحال اسلامی ہے تعجب خیز ہے"۔

(مکتوبات شیخ الاسلام جلد دوم مطبوعہ دیوبند ص۲۸۷ تا ۲۸۹)

ان ہی مولانا عبدالرحیم نے مولانا مدنی کی توجہ مظالم بہار اور گڈھ مکتیشر کے فسادات کی طرف دلائی تو مدنی صاحب یوں گل فشاں ہوئے۔

" جو مظالم بہار اور گڈھ مکتیشر وغیرہ میں دل گداز واقع ہوئے ہیں یقیناً نہایت رنجدہ اور سنگین ہیں۔ مگر میرے محترم تصویر کے دوسرے رخ سے غافل رہنا بھی درست نہیں۔ ابتدا کس نے کی کبھی اس پر بھی غور فرمایا کہ نہیں! نواکھالی، پٹنہ میں ایسے مظالم پہلے کس نے کئے تھے؟ ڈائریکٹ ایکشن ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو کس نے کیا جس سے کلکتہ کے فسادات کی ابتداء ہوئی؟ کیا اس تاریخ سے پہلے بھی یہ ہنگامی فرقہ وارانہ فسادات ہوئے تھے؟ کبھی ان امور پر آپ نے غور کیا۔ ڈائریکٹ ایکشن کے پہلے ڈیلیگیشن کے آنے کے بعد ہلاکو اور چنگیز خاں کی تقلید اور خون بہانے، امن و امان غارت کرنے اور تشدد کے اعلانات لگاتار کون کرتا رہا۔ کیا ان امور کی ابتداء لیگی لیڈروں اور اخباروں، لیگی تقریروں اور پوسٹروں سے لگاتار جاری نہیں رہی۔ آج لیگی ان تمام نقصانات کے باوجود خوش و خرم ہیں کہ یہی قربانیاں ہم کو پاکستان کے لئے ذریعہ ہیں۔ ان خیانتوں کی ابتداء مسلمانوں سے ہو رہی ہے تو کس پہ قصور رکھا جا سکتا ہے"۔ (مکتوبات شیخ الاسلام حصہ دوم ص۲۸۵ تا ۲۸۷)

مندرجہ بالا خطوط سے واضح ہوتا ہے کہ مدنی صاحب ہندوستان کی حکومت کو اس لئے اچھا سمجھتے تھے کہ وہ اصلی کافروں کی حکومت تھی اور پاکستان کی حکومت کو اس لئے بُرا سمجھتے تھے کہ یہ انکے نزدیک ملحدوں اور مرتدوں کی حکومت تھی۔

(۴) ۱۹۴۷ء تک ملک گیر فسادات کی ذمہ داری مسلم لیگ پہ ڈالتے تھے اور کانگرس کو اس سلسلہ میں بالکل معصوم سمجھتے تھے۔

(۵)

مولانا حامد میاں فرماتے ہیں:-

---

[1] قائداعظم نے ہماری معلومات کے مطابق کبھی ایسا نہیں کہا تھا۔ (طلوع اسلام)

"۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کو عارضی حکومت کا قیام عمل میں آیا تو کیبنٹ کے چودہ ممبروں میں پانچ مسلمان تھے۔ یعنی ۱/۳ سے کچھ زیادہ۔ اور مالیات کا اہم ترین محکمہ نوابزادہ لیاقت علی خان کے سپرد کیا گیا تھا۔ سردار پٹیل جو اس عارضی حکومت میں وزیر داخلہ بنائے گئے تھے ان کو اس سے سخت تکلیف ہوئی کہ وہ اپنے اختیارات سے ایک چپراسی کا تقرر بھی نہیں کر سکتے۔ چپراسی کیلئے بھی وزیر مال نوابزادہ لیاقت علی خان کی منظوری کے محتاج ہیں۔ اس ایک واقعہ سے یہ دلیل مضبوط ہو رہی تھی کہ متحدہ ہندوستان میں مسلمان ایک فیصلہ کن پوزیشن اختیار کر سکتے ہیں کہ اکثریت ان کی دستِ نگر بن جائے"۔

(روزنامہ جنگ لاہور، ۱۷ دسمبر ۱۹۸۳ء)

حامد میاں صاحب پر واضح ہونا چاہیئے کہ اس وقت مرکزی طاقت انگریز کے پاس تھی لیکن انکے پیش کردہ جمعیت العلمائے ہند کے فارمولا سے ثابت ہوتا ہے کہ مرکزی اختیارات اکثریتی پارٹی یعنی ہندوؤں کے ہاتھ میں ہوں گے اور اگر ایسے حالات میں لیاقت علی خان صاحب ایسا بجٹ پیش کریں گے جو انہوں نے انگریزی دورِ حکومت میں کیا تھا تو انکی بھی وہی حالت ہوتی جو تقسیم ملک کے بعد مولانا مدنی کی ہو گئی تھی۔ اپنی حالتِ زار کا ذکر مدنی صاحب، جناب مشتاق احمد صاحب کے نام اس طرح کرتے ہیں۔

جو کٹنگ آپ نے ملاپ کا بھیجا وہ پورا شائع نہیں کیا گیا۔ وفد مذکور آیا۔ اس نے گئو رکھشا کی حمایت کی خواستگاری کی۔ میں نے جواب میں کہا کہ آپ لوگ اپنی اکثریت سے جو چاہیں، پاس کروا سکتے ہیں ہم اس میں کوئی حمایت نہیں کریں گے غیر جانبدار رہیں گے۔ (مکتوبات شیخ الاسلام، جلد دوم صـ ۳۳۹ تا ۳۴۱)

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثریت جو چاہے کروا سکتی ہے اور مولانا مدنی جیسا جری اور ذی اثر انسان بھی حق بات نہیں کہہ سکتا بلکہ غیر جانبدار رہنے پر مجبور رہے۔ جمعیت العلمائے ہند کا فارمولا بظاہر کتنا ہی دلفریب اور خوش کن ہو، لیکن چونکہ اس فارمولا کے مطابق مرکزی طاقت اکثریت یعنی ہندوؤں کے پاس رہتی تو وہ جو چاہتے اکثریت کے بل بوتے پر کروا سکتے اور پورے برصغیر میں اسلامی روایات کو ملیامیٹ کرنے میں دریغ نہ کرتے اور کوئی بھی دینی مدرسہ زندہ نہ رہ سکتا جب تک کہ وہ دیوبند کی طرح ہندو حکمران کی سرپرستی قبول نہ کرتا۔ دیوبند کے صد سالہ جشن کے موقع پر ہر فرد خاندان جسطرح دیوبند کی فضا پر چھایا رہا وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔

آخر میں ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں نیشنلسٹ لیڈروں کو مسلم لیگ کے مقابلے میں جو شکست ہوئی اس پر مولانا مدنی کا تبصرہ نقل کرنے کے بعد اس تبصرہ کو ختم کیا جاتا ہے۔ اگر ضرورت ہوئی تو اس موضوع پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ مدنی صاحب کا تبصرہ ملاحظہ ہو:۔

"مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں مسلم لیگ نے مسلمانوں کی سو فیصد نشستیں جیت لیں اور پنڈت نہرو، اچاریہ کرپلانی اور مولوی حسین احمد نے اپنی شکست کی یہ توجیہ پیش کی تھی کہ مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں ووٹروں کا معیار بہت بلند ہے، یعنی اونچے طبقے کے مسلمان لیگ کے ساتھ ہیں۔ شکست کیلئے دوسرا یہ عذر پیش کیا گیا کہ ہماری تیاری مکمل نہ تھی"۔

("پاکستان ہمارا" مرتبہ بشیر افغانی۔ مطبوعہ لاہور، صـ ۴۲)

نقد و نظر

طلوعِ اسلام بابت جنوری ۱۹۸۱ء اٹھائیے اور اس میں اُس تبصرہ کو دیکھئے جس کا عنوان تھا:-

سنیئے! قرآن کی آواز کہاں سے اٹھ رہی ہے؟

یہ قرآن کی آواز کیا تھی اور کہاں سے اٹھی تھی؟ یہ آواز تھی قرآن کے معاشی نظامِ ربوبیت کی اور اٹھی تھی خود ایوانِ حکومت سے! اپریل ۱۹۸۰ء میں حکومتِ پاکستان کی وزارتِ مالیات نے اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی کہ وہ حکومت کی راہنمائی کے لئے اقتصادی اصلاحات کا ایجنڈا مرتب کرے۔ اس کمیٹی کے ارکان تھے۔ (۱) پروفیسر سید نواب حیدر نقوی، ڈائریکٹر پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف ڈویلپمنٹ اکنامکس (۲) محترم ایچ۔ یو۔ بیگ سیکرٹری منسٹری اوف فنانس (۳) پروفیسر فیض احمد پروانش چانسلر پنجاب یونیورسٹی اور (۴) پروفیسر میاں ایم۔ نذیر۔ پروفیسر اوف اکنامکس پشاور یونیورسٹی۔ انہوں نے وہ رپورٹ مرتب فرمائی تھی جس پر طلوعِ اسلام نے تبصرہ کرتے ہوئے ان کی خدمت میں ہدیہ تبریک و تہنیت پیش کیا تھا۔ اب انہی حضرات نے ایک کتابچہ شائع کیا ہے جس کا نام ہے۔ پرنسپلز اوف اسلامک اکنامک ریفارم (زبانِ انگریزی) انہوں نے اس کے دیباچہ میں کہا ہے کہ اس کتابچہ کو ان کی سابقہ رپورٹ کی نشوونما یافتہ شکل نہ سمجھا جائے۔ یہ ایک جداگانہ تصنیف ہے۔ یہ ان کی تصنیف ہے اس لئے اس کے متعلق ان کی رائے انسب قرار پا سکتی ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ اسی برخوردار کی عنفوانِ شباب کی تصویر ہے۔ وہی خط و خال۔ وہی شکل و شباہت۔ وہی چال ڈھال۔ وہی رنگ ڈھنگ۔ بس ذرا قد کاٹھ بڑا ہو گیا ہے۔ جن بنیادوں پر یہ عمارت اٹھائی گئی ہے، وہ وہی ہیں۔ یعنی یہ کہ یہ جو کچھ کہا اور سمجھا جا رہا ہے کہ سود کا نام منافع رکھ دینے اور اڑھائی فیصد زکوٰۃ کاٹ لینے سے، اقتصادی نظام، اسلامی ہو جاتا ہے اور اس سے جملہ مسائل حل ہو جاتے ہیں، تو یہ اسلام کے نظام سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ اس سے نہ معاشی نظام، اسلامی ہو جاتا ہے۔ نہ ہی یہ (جملہ تو ایکطرف) کسی ایک مسئلہ کا بھی حل قرار پا سکتا ہے۔ موجودہ (سرمایہ دارانہ) نظام کو اسلامی بنانے کے لئے، اس نظام کو پورے کا پورا الٹ کر اس کی جگہ قرآن

کا نظام نافذ کرنا ہوگا۔ اس سے مرتبین کی یہ وضاحت بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ
یہ گورنمنٹ کی رپورٹ نہیں۔ یہ مرتبین کے اپنے ذاتی خیالات کی مظہر ہے
جو نہ تو حکومت کی ترجمانی کرتے ہیں اور نہ ہی ان اداروں کے خیالات کی
ترجمانی جن کے ساتھ مرتبین وابستہ ہیں۔ (دیباچہ صفحہ)

ہم ان حضرات کی خدمت میں بار دیگر ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے موجودہ ماحول میں ایسے انقلاب انگیز قرآنی خیالات پیش کرنے کی جرأت کی۔ یہ جرأت۔ کہ اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں[1] اس دور میں قرآن کی بات کرنا، بڑی جرأت چاہتا ہے۔

زیرِ نظر کتابچہ میں جو امور اصولاً یا جزءً وہی ہیں جو سابقہ رپورٹ میں آچکے ہیں، ان پر ہمارا تبصرہ طلوعِ اسلام بابت جنوری ۱۹۸۱ء میں گذر چکا ہے۔ وہ کسی اضافہ کا محتاج نہیں۔ جو نکات وضاحت طلب ہیں، انہیں مختصر الفاظ میں پیش خدمت کیا جاتا ہے۔

(۱) ہم محسوس کرتے ہیں کہ قرآنِ کریم کے احکامات مثل وراثت۔ وصیت۔ ملکیت۔ دولت۔ صدقات۔ خیرات وغیرہ کے قرآنی نظامِ معیشت کے چوکھٹے میں فٹ کرنے میں ان حضرات کو دقت پیش آتی ہے۔ اگر قرآن کے معاشی نظام کے بنیادی اصول کو پیشِ نظر رکھا جائے تو پھر یہ دقتیں یا الجھنیں خود بخود دور ہو جاتی ہیں۔ وہ بنیادی اصول یہ ہے کہ اس کا معاشی نظام مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ (جیسا کہ ان حضرات نے خود لکھا ہے) ارشادِ خداوندی ہے کہ

زمین پر کوئی متنفس ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔

اور خدا کی یہ ذمہ داری اسلامی نظامِ مملکت کے ہاتھوں پوری ہوتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، جملہ افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانا، اسلامی مملکت کی ذمہ داری ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مملکت اپنی اس عظیم ذمہ داری سے اسی صورت میں عہدہ برآ ہو سکتی ہے جب وسائلِ رزق اور ذرائع پیداوار اس کی تحویل میں ہوں۔ اس صورت میں ان پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔

لیکن قرآن کے معاشی نظام کے اس منتہیٰ تک بتدریج پہنچا جائے گا۔ وراثت۔ وصیت۔ قرضہ وغیرہ سے متعلق احکام اس عبوری دور کے لئے ہیں۔ آخری منزل پر پہنچکر یہ احکام ساقط العمل ہو جائیں گے جسطرح قرآن میں دیئے گئے غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق احکام اب ساقط العمل ہیں کیونکہ غلاموں اور لونڈیوں کا وجود باقی نہیں رہا۔ اس

---

[1] رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا کے تھانے میں۔ کہ اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں۔

آخری منزل پر پہنچ کر نہ کسی کے پاس جائدادیں ہوتی ہیں۔ نہ زمین کے رقبات اور نہ ہی اپنی ضروریات سے زیادہ فاضلہ دولت۔ پرویز صاحب کا ایک مقالہ قرآن کا معاشی نظام۔ ایک سابقہ اشاعت میں شائع ہوا ہے جس میں ان منازل کا تشریحی ذکر ہے)۔

(۲) کتاب میں کہا گیا ہے کہ "اسلامی قانون اس کی اجازت دیتا ہے کہ ہر شخص اپنی دولت کا ایک تہائی حصہ وصیت کی رو سے، غیر وارثوں کو دے دے" (ص۷-۷)۔ یہ فقہ کا قانون ہے اور قرآن کے یکسر خلاف۔ قرآن میں نہ تو وصیت کے لئے کوئی حصہ مقرر ہے اور نہ ہی غیر وارثوں کی شرط۔

ہم ان حضرات کی خدمت میں عرض کریں گے کہ "اسلامی قانون" کہتے ہوئے اس کی تصریح نہایت ضروری ہوتی ہے کہ وہ مروجہ فقہی قانون ہے یا قرآن کا قانون۔ اس تصریح اور تمیز کے نہ ہونے سے اسلام عجیب و غریب قوانین و احکام کا ملغوبہ بنکر رہ گیا ہے۔

(۳) کہا گیا ہے کہ

مسلم علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ چراگاہیں، جنگلات، پانی کے سرچشمے، کانیں سڑکیں، قبرستان اور عبادتگاہیں کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتیں۔ (ص۷)

ان حضرات کو (غالباً) اس کا احساس نہیں ہوا کہ "علماء کے اس متفقہ فیصلہ" کو اسلامی قانون تسلیم کر لینے سے انہوں نے کتنا بڑا خطرہ مول لے لیا ہے۔ علماء کا اسی پر اتفاق نہیں۔ ان کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ زمینوں کے بے حد و نہایت رقبات، دولت انبار در انبار، وسیع و عریض جائدادیں، مزارعت، مضاربت، مشارکت وغیرہ (یعنی نظام سرمایہ داری کے یہ جملہ عناصر) اسلام کی رو سے جائز ہیں۔ لہٰذا جب آپ علماء کے کسی ایک فیصلہ کو اسلامی تسلیم کر لیں گے تو اس قسم کے دیگر فیصلوں کو بھی اسلامی تسلیم کرنا پڑیگا! اصول یہ ہے کہ فیصلہ کسی کا ہو، اگر وہ قرآن کریم کے مطابق ہے تو اسلامی ہے۔ اس کے خلاف ہے تو غیر اسلامی۔ علماء اور فقہا کا کوئی فیصلہ بھی فی ذاتہٖ سند نہیں قرار پا سکتا۔

(۴) ان حضرات کی ایک دشواری یہ بھی نظر آتی ہے کہ انہیں قرآنی آیات کے مروجہ تراجم پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ یہ تراجم (اردو کے ہوں یا انگریزی کے) ان تفاسیر پر مبنی ہوتے ہیں جو ہمارے دورِ ملوکیت اور سرمایہ داری میں مرتب ہوتی تھیں اس لئے وہ لامحالہ ان سے متاثر ہیں۔ قرآن نے اپنے متعلق کہا ہے کہ اس کی زبان عربی مبین ہے لہٰذا اس کے الفاظ (اور آیات) کا مفہوم زمانہ نزول قرآن کی عربی زبان کی رو سے سمجھ میں آ سکے گا۔ پرویز صاحب نے اس مفہوم کو اپنی لغات القرآن اور مفہوم القرآن میں متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ مروجہ تراجم پر انحصار کا نتیجہ ہے کہ ان حضرات نے (مثلاً)

انسان کو "زمین پر خدا کا نائب یا خلیفہ (VICEGERENT) کہا ہے۔ خدا اور انسان کا یہ تعلق صحیح نہیں۔ نائب یا خلیفہ (جانشین یا قائمقام) کسی کی عدم موجودگی میں، اس کی جگہ حاکم ہوتا ہے۔ خدا تو ہر آن اور "ہر جگہ" موجود ہے۔ لہٰذا اس کا جانشین کیسے؟ انسان خدا کا "بندہ (عبد)" یعنی اس کے احکام کو نافذ کرنے والا ہے۔ یہی انسان اور خدا کے تعلق کا صحیح تصور ہے۔ اس نے اپنی کتاب (ضابطہ قوانین) کو اس لئے مکمل۔ ابدی۔ غیر متبدل اور محفوظ قرار دیا ہے کہ اس کی موجودگی میں کسی اور کی ضرورت نہ رہے۔ صرف اس کے نافذ کرنے والوں کی ضرورت ہے۔ اس نے تو، اور تو اور رسول اللہ کو بھی اپنا عبد کہا ہے۔

(۵) قرآن کے معاشی نظام اور سوشلزم کے نظام کے بعض اجزا میں مماثلت پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے ہمارا قدامت پرست طبقہ، قرآنی نظام کے داعیان کے خلاف جھٹ سے کمیونسٹ (یعنی کافر ملحد) ہونے کا فتویٰ جڑ دیتا ہے۔ کتاب کے مرتبین نے اس اعتراض کا بڑا خوبصورت جواب دیا ہے جس کا ملخص یہ ہے کہ اگر قرآن کا معاشی نظام اس لئے مسترد کر دینے کے قابل ہے کہ اس کے بعض اجزاء میں اشتراکیت سے مماثلت پائی جاتی ہے تو ہمارا مروجہ معاشی نظام کسطرح اسلامی قرار پا جائیگا جو سرتا سر نظام سرمایہ داری کا چربہ ہے! یہ جواب منفی ہے۔ انہوں نے مثبت طور پر ان دونوں نظاموں میں جو فرق کیا ہے، اس پر نگہ بصیرت وجد میں آ جاتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ،

> اسلامی نظام کی امتیازی اور منفرد خصوصیت یہ ہے کہ اس میں معاشیات کو اخلاقیات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ (دیباچہ صفحہ ۲۱)

یہ فرق اسلام کے معاشی نظام اور سوشلزم ہی میں نہیں۔ اسلام اور سیکولرازم پر مبنی ہر نظام میں ہے۔ اسلام کا ہر نظام (معاشی، معاشرتی، سیاسی، عمرانی، تمدنی) ابدی اقدارِ خداوندی کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ سیکولرازم (خواہ وہ مغرب کا جمہوری نظام ہو، یا کمیونزم یا سوشلزم) ان اقدار کو الگ رکھ دیتا ہے۔

آخر میں اسلوبِ بیان کی ایک ایسی نرم و نازک پتی دامن کش ہوتی ہے جس سے اقبال کے استفہامیہ کے جواب میں "ہیرے کا جگر بھی کٹ" سکتا ہے۔ اور یہ حقیقت بھی سامنے آ جاتی ہے کہ یہ حضرات، چار و یا بیس قسم کے اقتصادیات کے ماہر ہی نہیں، شعر و ادب اور انکی لطافتوں سے بھی لذت چشیدہ ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ادبی ذوق کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آسکتا۔ انہیں اس کا احساس تھا کہ ہمارا موجودہ معاشرہ" اتنہ فرق تا بقدم غیر اسلامی سرمایہ دارانہ مفاد پرستیوں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، اور ان زنجیروں کو مذہبی تقدیس کی سند بھی حاصل ہے۔ ان حالات میں یہاں "اسلامائزیشن" کا

انقلاب بڑا دشوار گذار مرحلہ ہے۔ یہ راہ پھولوں کی نہیں، کانٹوں کی ہے۔

اس احساس کو انہوں نے ایک نقطہ میں اس طرح سمو کر رکھ دیا ہے جس پہ غالبؔ کی تشبیہ یاد آجاتی ہے کہ،

گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

انہوں نے لکھا ہے کہ،

آنسوؤں کے بغیر اسلامائیزیشن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا (دیباچہ VIII)

اس برجستگی کی داد اقبالؔ ہی دے سکتا ہے کہ جس نے کہا تھا کہ،

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

اس راہ میں سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ جن کی خاطر آپ اس وادیٔ پرخار میں قدم رکھتے ہیں، وہ بھی آپ کے خلاف ہوتے ہیں۔ جب آپ قرآنی نظام کو پیش کرتے ہیں تو چونکہ عوام سے کہا جاتا ہے کہ یہ الحاد اور بددینی ہے، سب سے پہلا پتھر انہی مفلسوں اور محتاجوں کی طرف سے آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب مجنوں کا باپ اپنی ہر کوشش میں ناکام رہ گیا تو اس نے لیلیٰ کے باپ کے قبیلہ پر حملہ کر دیا کہ اس طرح لیلیٰ کو لے آیا جائے۔ حملہ کرنے کے بعد اس نے دیکھا کہ اس کا لشکر بھی زیادہ ہے۔ اسلحہ بھی کثرت سے ہے اور کسی شے کی بھی کمی نہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کے لشکر کو فتح حاصل نہیں ہو رہی۔ بہتیرا سوچا کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ایک رات اس نے دیکھا کہ مجنوں اپنے خیمہ میں سربسجود کوئی دعا مانگ رہا ہے۔ قریب جا کر سنا تو وہ کہہ رہا تھا۔ یا اللہ! لیلیٰ کے باپ کی فتح۔ اس نے اس کے ایک لگائی اور کہا کہ اگر تیری دعا یہ ہے تو میرے لشکر کو کیوں کٹوا رہا ہے۔ سو جن مفلسوں اور ناداروں کی خاطر آپ دنیا جہاں سے یہ جنگ مول لیں گے، وہ آپ کے مخالفین کی فتح کی دعائیں مانگ رہے ہوں گے! اسے پیشِ نظر رکھ کر اس قسم کا اعلانِ جنگ کیجیئے گا۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہے۔

آخر میں ہم ایک بار پھر ان حضرات کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں جنہوں نے اس قدر نامساعد ماحول میں قرآن کی آواز بلند کرنے کی جرأت کی ہے۔ انہی جیسے جرأت مندوں کی ہمت ہے جو اس قسم کے افسردگی و پژمردگی کے عالم میں انسان کو مایوس نہیں ہونے دیتی۔

از بند دو صد پیرم، یک حرف مرا یاد است عالم نشود ویراں تا میکدہ آباد است

اس سے خود ہمارا حوصلہ بھی بندھ جاتا ہے کہ۔ میرے اب یہاں رندِ دل اور بھی ہیں